منتخبہ

احمد ندیم قاسمی

ادارۂ اشاعت اردو
حیدرآباد (دکن)

انگڑائیاں

منتخبہ

احمد ندیم قاسمی

اِدارۂ اِشاعت اُردو
عابد روڈ۔ حیدر آباد (دکن)

پہلا ایڈیشن ——————— ایک ہزار

فروری ۱۹۴۴ء

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس۔ حیدر آباد (دکن)

فہرس

اُن فن کاروں کے نام

جن کی نگارشات سے یہ مجموعہ مزیّن ہے!

احمد ندیم قاسمی

اہلِ نظر سے!

ہر نیا مجموعہ پیش کرتے وقت ہمارے مد نظر صاف اور ستھرا، بلند اور غیر فانی سیار ہوتا ہے، ہم جدّت اور جدّت پر ادب کے تقدس اور عالمگیری کو قربان کرنے کے روادار نہیں، افسانوی ادب پیش کرتے وقت یہی نصب العین ہمارا رہنما رہا ندیم کے دو مجموعے گرداب اور سیلاب، منٹو کے ڈرامے اور افسانے۔ شفیق الرحمٰن کے افسانوں اور مضامین کا مجموعہ لہریں، جعفری کے "زندگی کے نئے زاویے" وغیرہ ہمارے اسی آدرش کے کامیاب نمائندے ہیں منتخب افسانوں کا یہ مجموعہ پیش کرنے سے ہمارا یہ مقصد ہے کہ ہم اردو کے اس ہمہ زا دور کے شہ پاروں کو ایک لڑی میں پرو دیں، اور گذشتہ دس بارہ برس میں افسانہ نے جو انگڑائیاں لی ہیں، ان کے ایک ایک خم، ایک ایک خط کو اجاگر کر دیں ہم یقین ہے

کہہ سکتے ہیں، کہ "انگڑائیاں" اردو افسانہ کی تاریخ میں ایک غیر فانی یادگار رہے گا، کیونکہ انتخاب میں نہ تو ناموں کی عظمت پیش نگاہ تھی، اور نہ کسی مقررہ رنگ کی نمایندگی۔ اور انتخاب کا کام ایسے افسانہ نگار کے حوالے کیا گیا، جو خود بھی ایک کامیاب فن کار ہے، اور جو جغرافیائی تعصب اور معاصرانہ چشمک سے کلیتہً آزاد اور بے پرواہے"

ادارہ اشاعت اردو۔ انگڑائیاں کے مرتب احمد ندیم قاسمی کو اس کامیاب انتخاب پر مبارک باد پیش کرتا ہے، اس نے افسانوں کے انتخاب اور ترتیب میں جس ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے، وہ "انگڑائیاں" کی کامیابی کی ایک بیّن دلیل ہے۔

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

"یہ سوچتی ہوئی آنکھوں والے زرد رو نوجوان مستقبل کے
سیاسی اور سماجی انقلابات کے خالق ہیں۔ انھیں ماضی کی
طرف نہ گھسیٹو۔ کیونکہ یہ امروز و فردا کے چہرے سے ماحول،
وراثت اور قانون و رواج کے دبیز پردے چاک کرنے نکلے ہیں"

'راہی'

ادب ایک نازک آبگینہ ہے، جس میں ابلتی ہوئی شراب پناہ لیتی ہے، میں اس سے زیادہ ادب کے متعلق نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں نہ کہہ سکتا ہوں۔

مختصر افسانہ اردو ادب کے لیے اب کوئی نئی چیز نہیں رہا، اور گزشتہ تیرہ برس میں تو اس نے کچھ ایسی پھریری لی ہے، کہ ہم شکست یا ندامت کے خوف کے بغیر اردو افسانہ کو یورپ کی ترقی یافتہ افسانوی ادب کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں، اردو افسانہ کی یہ فوری ترقی دنیا بھر کی زبانوں میں مثالی حیثیت رکھتی ہے، اس کی وجہ وہ تیزی سے پہلو بدلتا ہوا سیاسی دھارا ہے، جس نے نوجوانوں کے ذہنوں میں تشکیک اور تذبذب کے نشیب و فراز تراشے ہیں، اور بوڑھوں کو کھسیانی سوچوں میں غرق کر دیا ہے

مقام مسرت ہے، کہ کمزور، بے سروپا اور بے کار افسانوں کے طوفان سے ہمارا غیر فانی ادب بچ نکلا، ہر زبان میں بلند ادب کے ساتھ ساتھ پست اور بھونڈی یاوہ گوئی سائے کی طرح لگی رہی ہے، لیکن دربارِ ادب میں بے مقصد چیزیں بار نہیں پا سکتیں۔ اردو ادب کے اِس بحرانی اور عبوری دور میں بھی بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں، ہر بوالہوس نے "حسن پرستی" کو اپنا شعار بنا لیا ہے، رسالے افسانوں کے دم سے زندہ ہیں، روزنامہ اخباروں کے خاص نمبر بھی افسانوں کی اِس یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکے، کہانیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے، کہ اچھی کہانیوں کا انتخاب بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

جب تنقید نگار فن کی تکمیل کا دعویٰ کرنے لگے، تو وہ در اصل ادبی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے، لیکن خوش قسمتی سے ابھی تک ہمارے نقادوں نے حرفِ آخر ہی کی رٹ شروع نہیں کی۔ اول تو ہمارے ہاں صحیح النظر نقادوں کی افسوسناک کمی ہے، لیکن جو چند ایک "راہ دان" ہیں، وہ ابھی تک جدید افسانہ کی تکنیک اور تعمیر کے لیے ایک خاص سانچہ تجویز نہیں کر سکے، ہر نوع کے افسانے لکھے جا رہے ہیں، اور ہر نوع کی تنقیدیں کی جا رہی ہیں، یہ ہمارے ادب کی زندگی اور کشمکش زندگی کا ثبوت ہے۔

پریس کی حیرتناک ترقی ہمارے ادب کی توسیع کا سب سے بڑا سبب ہے، اب ہمارے ہاں اس قسم کے ادیب موجود نہیں، جو اُن پھولوں سے مماثلت رکھتے ہیں جو ویرانوں میں اُگے، اور مرجھا گئے، آج کل ہر ادیب منظرِ عام پر آ جاتا ہے، ہم اُس کی فن کاری کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں، نہایت آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے، کہ افسانہ نگاروں کے اِس انبوہ میں سے سچے اور بلند ادیب آسانی سے چن لیے گئے ہیں۔

یہ نئے افسانہ نگار تعلیم یافتہ ہیں، حساس ہیں، بے تکلف ہیں، بناوٹ سے نفرت کرتے ہیں، جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، وہی کہتے ہیں، اُن کے احساسات پر نہ قانون پہرہ بٹھا سکتا ہے اور نہ ماحول، وہ جانتے ہیں، کہ برسوں کی غلامی اور مدتوں کے ٹھیراؤ نے ہماری سماج کو متعفن کر دیا ہے، اور یہ تعفن صرف اِس طرح دور ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو اِس تعفن کا احساس دلایا جائے، ہمارا نیا ادب افیون نہیں بیچتا۔ وہ قمچیاں چلاتا ہے، چرکے لگاتا ہے، زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتا ہے، وہ جانتا ہے کہ زہر ہی زہر کا مداوا ہے، اُسے معلوم ہے کہ ہمارا پرانا ادب محکومیت کے اس خمار کی پیداوار ہے، جو دراصل حاکم کی مصلحت ہے لیکن جسے اس کی سخاوت پر محمول کیا جاتا ہے۔

اس تجرباتی دور میں کئی لغزشیں بھی ہوئی ہیں، کیونکہ تجربہ ناکام بھی ہو سکتا ہے لیکن نئے ادیبوں کی کاوش اور نیت پر شک کرنا اُن کی ترقی کی جڑیں کاٹنا ہے۔ بلاشبہ ہمارے افسانہ نگاروں نے مغربی ادب سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، لیکن جب مختصر افسانہ مغرب ہی کی تخلیق ہے، اور مغربیوں ہی نے اسے بنایا اور سنوارا، تو ہم پر لعن طعن کرنے والے ہمارے لیے کونسا دوسرا راستہ تجویز کرتے ہیں، مشرقی ادب میں داستان ہے، افسانہ نہیں، تخیل ہے، حقیقت نہیں خواب ہے، بیداری نہیں، وہ ہمیں سُلا تو سکتا ہے لیکن جگانے پر قادر نہیں۔ اُس کے پاس نشے ہیں، مگر ان نشوں کے توڑ سے اس کا دامن خالی ہے، وہ ہمیں الف لیلہ ایسی ضخیم کتاب دے سکتا ہے، موپساں کے مختصر افسانے نہیں دے سکتا، وہ جنوں دیووں اور پریوں کی باتیں کر سکتا ہے، مزدور کسان اور مفلس لڑکیوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ پلاٹ دے سکتا ہے، تجزیہ نہیں دے سکتا۔ اِس حالت میں ہم پر مغرب کی

نقالی کا الزام سراسر بے بنیاد ہے، ہم نے فن کی باریکیاں مغرب سے مستعار لی ہیں، لیکن ہم نے فن کے خطوط میں ہندوستانی رنگوں کو سمایا ہے، ہم نے اپنے دیہات کی گلی سڑی لاشوں پر سے ریشمی کفن اتارے ہیں، ہم نے چپ چاپ حویلیوں میں گھومتی ہوئی شرمیلی عورتوں کی دہاڑتی ہوئی تنہائیوں کے راز کھولے ہیں ہم گالیاں نہیں دیتے، سچائیاں بیان کرتے ہیں ہم عریانی کے شیدا نہیں، ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سب عریاں ہو رہے ہیں اگر ہمارے نفسیاتی تجزیوں سے آپ کا جذبۂ نفس پرستی بیدار ہو جاتا ہے، تو یہ آپ کی کم ظرفی ہے، آپ سطح پر تیرنے کی بجائے تہوں پر جائیے، زندگی بہت عمیق ہے اور صاف ستھری سطح پر تھرکنے والوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ تہوں میں چٹانیں بھی ہیں، اور وہ خوفناک روئیدگی بھی ہے، جس میں زندگی پھڑپھڑا رہی ہے۔

یہاں مجھے افسانہ کے اندازِ تعمیر سے سروکار نہیں، کیونکہ یہ نقادوں کا کام ہے، مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ افسانہ روز بروز ترقی کر رہا ہے، پہلے پہلے امکان اور اتفاق تخیلی ادب کے ضروری عناصر تھے، اب ہم صرف حقیقتوں سے کام لے سکتے ہیں، ہمارے افسانوں کی ابتدا میں تعجب اور انتظار کی سرسراتی ہوئی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، ہمارے افسانے ان ہوائی جہازوں کی طرح نہیں، جو ہمیں زمین سے اٹھا کر فضا میں لے جاتے ہیں، اور اِدھر اُدھر گھما کر پھر زمین پر اتار دیتے ہیں، اب ہم اپنے پڑھنے والوں کو فضا میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں، نیچے اترنے کے لیے وہ خود ہی نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں، اس لیے ہمارے

افسانوں کے انجام بھی فنی لحاظ سے بہت بلند ہو رہے ہیں، ہم ہیرو کی پرستش کے قائل نہیں۔ ہم ہر چیز کو سنہری دھندلکے میں دیکھنے کے عادی نہیں، ہم حقیقت نگار ہیں اور حقیقت نقابوں کی دشمن ہے۔

ہمارے ہاں پلاٹ بھی ہے، لیکن ہم اسے فن کا لابدی جز قرار نہیں دیتے۔ ہم کردار نگاری کرتے ہیں، اور ہمارا افسانہ جس چیز پر مدتوں تک فخر کر سکتا ہے، وہ کردار نگاری ہی ہے، ہمارے افسانوں کے مکالمے جناتی نہیں۔ ہم خوابوں میں نہیں بڑبڑاتے، ہمارا مشاہدہ کسی سے کوئی رنگین عینک مستعار نہیں لیتا، صدق اور خلوص سے ہم وہی کچھ کہ دیتے ہیں، جو ہم دیکھتے ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ مشاہدہ کی باریکی اور گہرائی ہمارے جدید افسانہ کی وہ خصوصیت ہے، جو دوسری زبانوں کے ادب میں اتنی فراوانی سے نہیں ملتی۔ اس کی وجہ وہ شدتِ احساس ہے، جو ہماری مجبوریوں کی پیداوار ہے، ہم میں سے ہر ایک کا اپنا اسلوب ہے اسٹائل کے متعلق کوئی اصول مقرر نہیں، ہمارے جذبات واحساسات ہمارا اسٹائل خود بخود بناتے چلے جاتے ہیں، جو حضرات اسلوب کے لیے کوئی قانون وضع کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اسلوب کی باریکیوں سے نابلد ہیں کئی قابلِ رحم نقاد نئے لکھنے والوں پر "جذباتیت" کا الزام دھرتے ہیں، لیکن آنسوؤں کی معمولی سی نمکینی کی وجہ سے ہمارے ماتھوں پر جذباتیت کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔

ہم تصویروں میں سوچتے ہیں، ان تصویروں کو من مانی ترتیب نہیں دیتے منطقی ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اس ماحول کو نہایت غور اور محنت سے پرکھتے ہیں،

جو اِن تصویروں کو سہارا دیتا ہے، ہم بہت کم کہتے ہیں، ہمارا کام صرف اشارہ کرنا ہے، (Sugoestion) ہمارے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے،

ہم جب اپنے افسانوں کے کرداروں کی ذہنیتوں کو ٹکراتے ہیں، تو یہ ٹکراؤ اتفاقی نہیں ہوتا۔ واقعات کا بہاؤ اور اذہان کی تدریجی ترقی کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے، ہم حتی الوسع اختصار سے کام لیتے ہیں۔ لیکن افسانے کی پیمائش کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں، ہمارا افسانہ پچاس سطروں میں بھی ختم ہو سکتا ہے اور پچاس صفحوں میں بھی۔ لیکن ہم الفاظ کی بھرمار سے اجتناب کرتے ہیں، آوارگیٔ خیال سے کتراتے ہیں، ہمارے افسانوں کا ہر لفظ کردار۔ پلاٹ اور ماحول سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتا ہے، محل اور موقع کی پہچان کے بعد ہم اُن میں درد بھی لے آتے ہیں اور مزاح بھی۔ ہم پرانی لکیر کے فقیر نہیں، جدّتِ خیال کو ہم بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ہم اپنے موضوع سے خلوص برتتے ہیں، ہم اِسے ناہیں کہتے، اور اِن کے ساتھ ساتھ ہم زبان پر کند آرے چلانے کے بھی روادار نہیں، ہم زبان کو وسیع کرتے ہیں، اُسے چند تراکیب کے محبسوں میں نہیں جکڑتے، زبان کا احترام ہمارا عزیز ترین فرض ہے۔

فارم کے حسن اور بیان کی صفائی کو ہم حقیقت نگاری کے جوش میں فراموش نہیں کرتے، ہم سنجیدگی سے سوچتے ہیں، اور سنجیدگی سے کہتے ہیں، اگر ہمارے پڑھنے والے بھی اُسی سنجیدگی اور گہرائی سے کام لیں تو اُن کے نفسیاتی جذبات میں کوئی کھلبلی نہ مچے، ہم اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتے، ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور توقع کرتے ہیں، کہ وہ لوگ بھی ہمیں زندہ رہنے دیں۔ جو ہمارے جذبات

واحساسات کو ابھی تک گرفت میں نہیں لا سکے جو ہماری عریاں نگاری کا رونا روتے
ہیں، لیکن اپنی عریانی کا اُنھیں علم تک نہیں، جو ہماری پرائیویٹ زندگیوں پر لعن طعن
کرتے ہیں، لیکن اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی زندگیوں پر دبیز پردے ڈالے رہتے ہیں،
وہ جانتے ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے،
اُنھوں نے یہ دیواریں پھاندی ہیں، ہم اِس دیوار ہی کو سرے سے گرا دینا چاہتے
ہیں، بس یہی فرق ہے، جس نے نئے افسانہ نگاروں کو بزرگوں کا معتوب بنا رکھا ہے
ہم مارکسیت، کمیونزم اور سوشلزم کا پروپیگنڈا نہیں کرتے، پروپیگنڈا آرٹ کی
موت ہے، اگر ہمارا اندازِ فکر ان تحریکوں سے کوئی مطابقت رکھتا ہے، تو اِس
مطابقت کو پروپیگنڈا کہنا نہایت سطحی سوچ کا نتیجہ ہے،

ہم حیات کے نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے نکلے ہیں، ہمارے مدنظر انسانیت
کا مفاد ہے، ہمارے مدنظر وہ آزادی ہے، جو برسوں کی غلامی تلے دب کر سسک
رہی ہے، ہمارے مدنظر عمل و حرکت اور احساس ہے، ہم اگر کسبیوں کی کہانی لکھتے ہیں
تو محض اِس لیے کہ اُن پیکروں پر چڑھی ہوئی غازے مسی کی تہیں ہمارے بزرگوں
کے پسینے کی کمائی سے خریدی جاتی ہیں، ہم اگر کسانوں کے متعلق لکھتے ہیں، تو صرف
اس لیے، کہ ان کے کھلیانوں پر ہمارے سرمایہ دار زندگی بھر تاک لگائے بیٹھے رہتے
ہیں، اگر ہم نفسیاتی تجزیوں کی طرف جھک چلے ہیں، تو بس اس خاطر، کہ انسانی ذہن
ہی عمل کا پیش خیمہ ہے، ہم مینار کا کلس دیکھنے سے پہلے اُس کی بنیاد کو کریدتے ہیں
اور چونکہ ہمارا یہ اندازِ نظر موجودہ ماحول میں انوکھا سا ہے، اس لیے ہمیں نفرت کی نظروں
سے دیکھا جاتا ہے۔

لیکن ہم اپنے عقائد کو پتھر پر لکیر نہیں سمجھتے ہم اپنے رہنماؤں کی قدر کرتے ہیں، صرف اگر ہمارے رہنما اس زہرناک ماحول میں سانس لینے سے اجتناب کریں، جس نے ہمارے ملک کی اکثریت کو موت اور زندگی کے درمیان اٹالٹکا رکھا ہے۔

یہ مجموعہ جدید افسانہ نگاروں کی کس حد تک نمایندگی کرتا ہے، اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، میں نے کوشش کی ہے، کہ جدید افسانہ کے ہر اسکول کی نمائندگی ہو سکے، افسانہ نگار اور اس کے افسانہ کے متعلق میں نے ہر افسانہ کے شروع میں ایک مختصر سا نوٹ دے دیا ہے، اس لیے یہاں سب فن کاروں کے متعلق تفصیلی بحث کرنا ضروری نہیں، آپ کو یہاں نڈر اور بے باک منٹو ملے گا، جو نئے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ بدنام لیکن سب سے زیادہ کامیاب ہے، عصمت ملے گی، جس کی صحیح جرأت کی داد صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنھوں نے عصمت کے فاش کئے ہوئے رازوں کو گھروں کی چار دیواریوں میں سرسراتے دیکھا ہے، کرشن بھی یہاں موجود ہے، جس نے جنت کشمیر کے اس پہلو کی بے مثال اور کامیاب نقاب کشائی کی ہے، جو جہنم کو شرماتی ہے۔ عسکری کا نفسیاتی تجزیہ بھی آپ یہاں پائیں گے، وہ تجزیہ جس نے سطح بینوں کی حصوں میں کھلبلی ڈال دی ہے، بیدی کی گہرائی، ——— مفتی کا تحت الشعوری الجھاؤ۔ اختر انصاری کی حقیقت نگاری۔ اشک کی سماجی آویزش، شفیق کی محبت آلود تلخی اور حسینی کی جزیات نگاری ——— یہ سب کچھ آپ کو انگڑائیاں میں ملے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ چند افسانہ نگار اس فہرست میں شامل نہیں۔ لیکن انگڑائیاں کا دوسرا حصہ انشاءاللہ اس کمی کو پورا کر دے گا،

میں اُن افسانہ نگاروں اور پبلشروں کا ممنون ہوں، جنھوں نے مجھے ان افسانوں کو "انگڑائیاں" میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ اور اُن افسانہ نگاروں اور پبلشروں سے عذر خواہ ہوں، جن سے میں اجازت طلب نہ کر سکا۔ مجھے امید ہے کہ انگڑائیاں کی افادیت ان کے اطمینان کے لیے کافی ثابت ہو گی۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے، کہ یہ چند سطور میں نے بحیثیت نقاد نہیں لکھیں۔ صرف ایک ایسے افسانہ نگار کی حیثیت سے لکھی ہیں، جو اس نئی جماعت کا ایک ادنیٰ سا فرد ہے، اور جس نے اپنے معاصرین کے فن کو فن کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے،

میورروڈ۔ لاہور
فروری ۱۹۴۴ء

احمد ندیم قاسمی

سعادت حسن منٹو

نَعرَہ

منٹو ہندوستان کا سب سے بڑا جدت پسند افسانہ نگار ہے، اُسے
پلاٹ کی فراہمی میں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ زندگی اس کی نظروں میں
لاتعداد افسانوں کا ایک مرقع ہے، واقعات وحادثات اس کے سامنے
صف باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ زیر نظر افسانہ اس کے فن کی کامیاب ترین
نمائندگی کرتا ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں نفسیاتی تجزیہ کا ایسا جچا تلا اسلوب
صرف منٹو کے ہاں ملتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی دماغی کشمکش اور تحت الشعوری
بڑبڑاہٹوں کے متعلق کھلے ہوئے اپنے افسانے کو علم النفس کی کتابوں کی طرح
پھیکا نہیں پڑنے دیا۔ اور کیشو لال کماری سیکھ والے کی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر
ایک فرا سے واقعہ کو — سیٹھ کی گالی کو — ایسے صناعانہ انداز
میں پیش کرجاتا ہے۔ کہ پڑھنے والا ہر سطر کے بعد سوچتا ہے "منٹو اس سے
آگے آخر کیا کہے گا!" — لیکن منٹو جو کچھ بھی کہے گا وہ بالکل نئی انوکھی
مگر سچی بات ہوگی، شاعری سے اُسے دور کا بھی واسطہ نہیں اس کی حقیقت
پسندی اُسے پتھر کو پتھر اور اینٹ کو اینٹ کہنے پر مجبور کرتی ہے، اور شاید یہی
وجہ ہے کہ وہ لوگ اس بے مثل افسانہ نگار کا نام سن کر ناک بھوں چڑھانے
لگتے ہیں جنھیں سماج اور رواج نے اینٹ کو پتھر اور پتھر کو اینٹ کہنے پر مجبور
کر رکھا ہے۔ تشبیہات کا وہ بادشاہ ہے اور الفاظ کی الٹ پھیر کا ماہر —
نعرہ اردو کے ان چند افسانوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، جو روس اور
فرانس کی بہترین کہانیوں کے مقابلہ میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اُترا اور ان تمام منزلوں کا بوجھ اُس کے چوڑے مگر دُبلے کاندھوں پر سوار ہوتا گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا تھا اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اُس نے اپنے دل میں سوچا تھا، مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں، اس کی بپتا ضرور سنے گا اور کرایہ چکانے کے لیے اُسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا — بخش دے گا! ...... یہ سوچتے ہوئے اُس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی۔ لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت بھی معلوم ہو گئی تھی...... وہ بھیک مانگنے ہی تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے دکھ درد سنا کر اور اپنے گھاو دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے —!

اُس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اُس نے اپنے غرور کو، اُس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے نکال کر گزرگاہ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کیا کرتا تھا اور

ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تنگ سے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اُس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدی سی آواز گونجی۔

"کیشو لال..... کھولی پانچویں، دوسرا مالا..... دو مہینے کا کرایہ..... لے آئے ہو کیا؟"

یہ سن کر اُس نے اپنا دل، جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤ، وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کرید کرید کر ہرے کر چکا تھا، سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اُس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ پر..... سیٹھ جی نے کچھ سُننا نہ چاہا۔ اور اس کے سینے میں ایک ہڑ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے وہ تمام دُکھ جو بیت چکے تھے، گئے گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اپنے دل میں بھر لیے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جو مدت ہوئی مٹ چکے تھے، اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو وہ کیسے سنبھالے؟

اُس کے گھر میں بن بلائے مہمان آ گئے ہوتے تو وہ اُن سے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہہ سکتا تھا "جاؤ بھئی جاؤ، میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمھیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارات کر سکوں"۔ لیکن یہاں تو قصہ ہی اور تھا۔ اس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دکھوں کو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر آپ اپنے سینے میں جمع کیا تھا، اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افراتفری میں اُسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اُس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جوں جوں اُس نے سوچنا شروع کیا، وہ پہچاننے لگا۔ کہ فلاں دکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اُسے فلاں وقت پر ہوا تھا۔ اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دھندھلا دی جوان پر لپٹی ہوئی تھی اور کل کے تمام دکھ درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اُسنے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اُس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اُس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا، کئی بار اُس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر ٹنگ کر پھر اُس کے میلے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اُسے اُن داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی، وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اُسے خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اُسے کیا خیال آیا تھا مگر وہ اُس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا، اُس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آ کر اُسے گالی دی ——— گالی ..... یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچا

اُس کا کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا، جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی شرارت سے بھگدڑ

مچ جایا کرتی ہے، ٹھیک اُسی طرح اُس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت

جتن کئے کہ اس کے وہ دکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کئے

تھے چپ چاپ رہیں پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلنا تھا کہ وہ تمام

بے چین ہو گئے اور اندھا دھند ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اب تو

وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی

تھیں، آنسو آ گئے۔ جس سے اُن کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اُس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ

کے جھریاں پڑے چہرے پر تھوک دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور

تو باہر گزرگاہ پر پڑا ہے، اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے غرور......

اُس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور اُن کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے

وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر رکھے کے باعث گیلے

ہو رہے تھے، ناچنے لگے۔

اس کی آنکھیں ہنسیں اس کا دل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہوا، پر وہ کڑواہٹ

دور نہ ہوئی جو اُس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر

صرف زبان پر ہوتی تو وہ اُسے تھوک دیتا۔ مگر وہ تو بہت بُری طرح اس کے

گلے میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہ نکلتی تھی، اور پھر ایک عجیب قسم کا دُکھ جو اُس

گالی نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس

ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں، اُس کے سینے

اندر اتر کر آنسو بہا رہی ہیں، جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اُسے پھر گالی دی۔ اُتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اوپر سے اُس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اُس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لیے بڑھا پر اُس گالی کی ساری گرد اس پر پھیل چکی تھی ـــــ اب اس نے وہاں ٹھہرنا اچھا نہ سمجھا کیونکہ کیا خبر تھی...... کیا خبر تھی!...... اُسے کچھ خبر نہ تھی...... وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اترا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اُس کے کندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

ایک نہیں، دو گالیاں ـــــ بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کی مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں۔ اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اُس ...... اُس ...... اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اُس کے دل میں اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی، وہ کیسے اس تپ کو دور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟...... پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑا بنا ہوا تھا، جس میں بہت سے پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں، جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا کسی دوسرے خیال سے جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا بھڑ جاتا تھا، اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اُس کے دکھ قے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے،

اُس کے جی میں آئی، جی میں کیا آئی۔ مجبوری کی حالت میں وہ اُس آدمی کو روک کر، جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس سے گزر رہا تھا، یہ کہنے ہی والا تھا "بھیا میں روگی ہوں" مگر جب اُس نے اُس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اُس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا اسے اس سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا، ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فٹ پاتھ میں چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک اس نے کبھی ان کی سختی محسوس نہ کی تھی، مگر آج ان کی سختی اُس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اُس کے قدم پڑ رہے تھے، اس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اُس کا بند بند ڈھیلا ہو گیا۔

چلتے چلتے اُس کی ایک لڑکے سے ٹکر ہوئی اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے جھٹ اُس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں، اِدھر اُدھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کر دیا۔

اُس کا دماغ اُس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اُسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اس کا دماغ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی بار اُسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا جس کے اس طرف سڑک پر لوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں، ٹرامیں، بھاری بھرکم ٹرک، لاریاں یہ سب

سڑک کی کالی چھاتی پر روندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا، پر اس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے، جیسے ریل گاڑی کا انجن زاید بھاپ باہر نکال رہا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر روند دیا گیا ہے، "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے پھر اُسے گالی دی ہے ...... گالی ...... گالی ٹھیک اُسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی رُوح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اُسے اس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا۔ جو اس کے گھر میں برکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی، اور نہ اُسے روئی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن کے پر ماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ وہ کبھی ننگا ہی پھرا تھا۔ اُسے صرف اس بات کا دُکھ تھا کہ اُسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا، وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے، اُس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے۔ شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لیے دو نی پیدا کرے یا اُس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکانوں اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اُونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اُس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا تھا کہ زبردستی اُس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے۔ اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چُکتا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار

ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی جو اسے کھائے جا رہی تھی۔ اُسے ان بیس روپوں کی پروانہ تھی جو اُسے آج نہیں کل ادا کر دینے تھے، وہ اُن دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو ان بیس روپے کا نقومش ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے مُنہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھنوان تھا، اُس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اُس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے تھے، اس کے غلام تو نہیں تھے، اور اگر غلام بھی ہوتے تو بھی وہ انھیں گالی کیسے دے سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، اُسے کرایہ چاہیئے، پر میں کہاں سے لاؤں، پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں، جب ہوگا، دے دوں گا پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا۔ پر میں نے اُسے کبھی گالی نہ دی۔ حالانکہ مجھے اُس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں، میں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے، اُسے بنوا دیجئے۔ پر میری ایک نہ سنی گئی۔ میری بھولی سی بچی گری، اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بے کار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اُسے بددُعائیں دے سکتا تھا، پر مجھے اُس کا دھیان ہی نہیں آیا۔ . . . . . دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپو ونیذر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کے مونگ پھلی کھاتے ہیں"

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس

اس سے بھی زیادہ دولت ہوگی، پر وہ غریب کیسے ہو گیا؟ ......

اسے غریب سمجھ کر تو گالی دی گئی تھی ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ وہ کرسی پر بڑے اطمینان سے اُسے دو گالیاں سنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بری بات ہے، اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھئے تو اس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا، اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی، پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوا دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اُس کو اولاد بہت پیاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی، سب کی سب اُسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ ــــ کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا؟ باپ اپنا ...... وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کے لیے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا ......

چوری۔ نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا ...... یوں سمجھئے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا، مگر وہ چور کبھی نہ بنتا ......

وہ اپنی چھنی ہوئی چیز واپس لینے کے لیے لڑنے مرنے کو تیار تھا، پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اُس وقت جب سیٹھ نے اُسے گالی دی تھی، آگے بڑھ کر

اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اُس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا، جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا .... نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اُسے گالی کیوں دی؟ ــــــ پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اُسے گالی دی تھی، اس لیے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے اور اس نے اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دُور بنچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اُسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا .... کیشو لال کھاری سینگ والا جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ــــــ سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ــــــ دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہے .... پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا، اُس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منھ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا، اس لیے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا .... مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے کیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اُسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں .... نہیں نہیں، گالیاں اُسے ہی دی گئی تھیں، اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ اسی کی طرف نکلتا تھا۔ اگر اُسے گالیاں نہ دی گئی ہوتیں تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں ہلڑ سا مچ رہا تھا کیا۔ بغیر کسی وجہ کے اسے دُکھ دے رہا تھا۔ اسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اُسے

ایسا معلوم ہوا کہ وہ وہ گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔۔۔ گالیاں۔۔۔۔۔ گالیاں۔۔۔۔ وہ جھنجلا گیا۔۔۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اُسے اُن کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اُس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے، دل ہی دل میں گالیاں دیں: "یوں اکڑ کے چل رہے ہیں جیسے ان کے باوا کا راج ہے۔"

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اُسے اُوپر تلے دو گالیاں سنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنے گدّے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دئے ہیں۔۔۔ سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ وہ بلبلا اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو جی بھر کے ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اُس کا پیٹ دکھنے لگتا۔۔۔ پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا، اُسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟۔۔۔ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رک گئے اس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لیے سستایا اور اُس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں۔۔۔ بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگرمچھ کے منہ کی طرح کھلتا تھا۔۔۔ لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا، سیٹھ کے گھر کی

طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟ —— کیا اُسے جرأت نہ تھی۔۔

اسے جرأت نہ تھی —— کتنے دکھ کی بات تھی کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی —— یہ گالیاں —— وہ اِن گالیوں کو کیا کہتا —— اِن گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولر سا پھیر دیا تھا —— صرف دو گالیوں نے —— حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو نے اُسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ موا کر دیا تھا اور اسے اتنی کمزوری محسوس نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی —— کیشو لال کھاری عینک والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا، آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے —— اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟ —— دو گالیوں نے!

گالیاں —— گالیاں —— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ اِن دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اُس کے سر پر دے مارے پر یہ کیسے ہو سکتا تھا —— اس کا سینہ مربّے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے، لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے، جس سے یہ گالیاں دُور رفان ہوں —— کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اسے دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟ —— ہوگا، پر کسی کو اُس کے دل کے حال کا کیا پتا تھا، وہ کھلی کتاب تھوڑی ہی تھی اور نہ اُس نے اپنا دل باہر لٹکار کھا تھا، اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو! —— پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو —— اگر کسی کو اندر کی بات کا

پتا چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لیے یہ ڈوب مرنے کی بات تھی
۔۔۔ گالیاں سن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں بہت بڑی بات تھی ۔۔۔ ہمالہ پہاڑ جتنی بڑی بات تھی، اس سے بھی بڑی بات تھی۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔ اس کی ذلت ہوئی تھی اس کی ناک کٹ گئی تھی ۔۔۔ اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا، چلو بھی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں ۔۔۔ وہ کمینہ تھا، رذیل تھا، نیچ تھا، گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا، کتا تھا ۔۔۔ اس کو گالیاں ہی ملنا چاہیے تھیں ۔۔۔ نہیں نہیں، کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے وہ اسے کچا نہ چبا جاتا ..... اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ..... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے وہ میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

"میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی ۔۔۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ سچ کہتا ہوں میں دیوانہ ہو جاؤں گا، ۔۔۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ میں ان سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا، بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا، ۔۔۔ مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں مر جاؤں گا اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے ..... یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا، جیسے میرے منہ میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں لولا، لنگڑا اپاہج تھا ..... پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے

آ کر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں۔...... میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک ختم ہو..... توبہ...... کوئی ٹھکانا ہے اس دکھ کا ـــــ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں ـــــ اس ٹریم کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلانا شروع کر دوں ...... کیا کروں اور کیا نہ کروں؟"

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے کہتا چلا جائے حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہو جائے، یا پھر اُس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کر دے "مجھے بچاؤ ـــــ مجھے بچاؤ!"

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں یہ کہنے ہی والا تھا "ٹھہرو ـــــ میری آگ بجھاتے جاؤ" مگر نہ جانے کیوں رُک گیا۔

ایکا ایکی اُس نے اپنے قدم تیز کر دئیے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رُکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے، لیکن جونہی اُس کی رفتار بڑھی۔ اُس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گُندھ گئے ـــــ دو مہینے کا کرایہ اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا ـــــ سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور...... یہ موٹی گالی...... پھر دوسری...... اور اس کی خاموشی...... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ

اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کئے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومتا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گیا جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کودنے لگی۔

وہ اب ڈرنے لگا، لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلایا "تم کیوں بھاگ رہے ہو، کس سے بھاگ رہے ہو، تم بزدل ہو"!

اس کے قدم آہستہ اٹھنے لگے، بریک سی لگ گئی اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا۔۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ بزدل تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ بھاگ کیوں رہا تھا؟۔۔۔۔۔۔ اُسے تو انتقام لینا تھا۔۔۔۔۔۔ انتقام۔۔۔۔۔۔

یہ سوچتے ہوئے اُسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی، لہو۔۔۔۔۔۔ لہو۔۔۔۔۔۔ اُسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔۔ لہو۔۔۔۔۔۔

اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ لے۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے ابھر آئے، اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اس کے قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی ــــ اب وہ انتقام پر تل گیا تھا۔

وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے وہ تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا، آگے بڑھتا رہا ــــ آگے ــــ آگے!

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی

ہے۔ اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں دکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے ـــ آگے ـــ بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی، اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پرواہوا کے مانند گزر گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنا لیا تھا تاکہ وقت پر کام آ سکے۔

مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہوا وہ اپولو بندر پہنچا ـــ اپولو بندر ـــ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی کی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ جب اُس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اُسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی ـــ اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالیشان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشو لال کھاری سنگھ والا اُس عالیشان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اُس نے اوپر دیکھا ـــ سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے حلق سے ایک نعرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم

لاوے کے مانند نکلا " ہت تیری......؟"

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑ پھڑانے لگے۔

نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مڑا تو اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو شور سن کر ڈر گئی ہوتی تھی کہا " پگلا ہے!"

عصمت چغتائی

تِل

عصمت چغتائی کا نام سُن کر کئی ادب نواز حضرات کہتے ہیں "وہی عصمت جس نے "لحاف" لکھا تھا!" ــــ اور راقم انہیں جواب دیتا ہے "جی ہاں وہی عصمت جس نے گھریلو جنت میں چھپے ہوئے اُس جہنم کا نہایت بے باکی اور جرأت سے تجزیہ کیا۔ جس کے شعلوں کو آپ کی چربی بھری پتیلوں نے گلزار سمجھ رکھا ہے!" ــــ یہ بے رحم اور بے پروا ادیبہ ہندوستانی معاشرت کی ہولناک پردوں کے اُن اسرار کو فاش کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے، جنھیں اب سے برسوں پہلے فاش ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن جو خاندانی وجاہت کے دبیز پردوں تلے چھپے رہے۔ "تِل" نفسی اور واقعاتی شاہدات کی خوبی کے علاوہ ایسی روانی اور گداز کا حامل ہے۔ کہ اس موضوع کا کسی دوسرے افسانہ نگار کے قلم سے تکمیل کی اس اوج کمال پر پہنچنا دشوار تھا۔ عصمت کے فن کی سب سے بڑی خصوصیات اُس کی حیرتناک حقیقت پسندی اور بے ساختہ مکالمے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ "تِل" میں اس کی بے مثال کردار نگاری کو دیکھ کر یہ اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل فن کار ہے اس کی کہانیاں پڑھ کر تیوری چڑھانے والوں نے اگر ابھی تک اپنا نظریہ نہیں بدلا۔ تو وہ یہ افسانہ پڑھیں۔ یقیناً وہ اس شکر چڑھی کونین کی گولی کو بدذائقہ محسوس نہیں کریں گے۔ اور ایک ننھے سے تِل کے اِرد گرد اشرف المخلوقات کے چند نمائندوں کی کائنات کو چکراتا دیکھ عصمت کی عظمت کے قائل ہو جائیں گے،

"چودھری — اے چودھری — سنو —" گنیش چندر چودھری چپ تھا

مدہوش —"

..... "کیا جھینگر کی طرح شی شی کرے جا رہے ہو۔ بھئی میں تھک گئی جو" چپکی بیٹھے گی

— کر —"

مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا — واہ — ساری پیٹھ تختہ ہو گئی — ہائے رام

— ہنک — ہنک —"

"چ چ چ —"

"مجھے سردی لگ رہی ہے —"

چودھری چپ۔

"یہاں — یہاں نیچے کولھوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں" دیکھ رانی

دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی —"

"اور کیا — کوئی میں مٹی کی بنی ہوں' واہ —" رانی نے اپنے موٹے

ہونٹ پھیلائے اور مصنوعی سنگ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

"چڑیل — کہتا ہوں سیدھی بیٹھ — حرامزادی —" چودھری نے

زنگون کی تھامی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

"تو — تو — تو پھر لو —" وہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ گئی چودھری

جل کر کوئلا ہو گیا ـــــ اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی قمچیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائے گی اور بہانہ کر کے رونے چیخنے لگے گی۔ اور پھر وہ تصویر جس کے لیے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

دیکھ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ ـــــ اور پھر ـــــ" چودھری نرمی سے بولا

تھک گئی نا ـــــ" وہ لوٹ کر چت ہو گئی۔

"تھک گئی! ـــــ اور جو سڑک پر دن بھر گوبر جنبتی تھی تو نہیں تھکتی تھی ـــــ کتیا کہیں کی۔" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

"کون بنیتیا تھا گوبر ـــــ تم بنیتے ہو گے ـــــ واہ کیسے ساس نندوں کے سے طعنہ دیتے ہو ـــــ" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔

"اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ ـــــ بس آدھ گھنٹہ ـــــ سمجھی ـــــ"

"آدھ گھنٹہ نہیں ـــــ بس چھ منٹ ـــــ" وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی بات یہ تھی چھ سات سے زیادہ تو اُسے گنتی بھی نہ آتی تھی۔ اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کے بہانے وہ اُسے آدھ گھنٹہ جمائے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا اور بھاری پھولدار مٹکی جھٹکے سے کاندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ مگر کتنی دیر کے لیے؟

"ٹھیک ہے نا ـــــ"

"ہاں ـــــ" چودھری جلدی سے جھک گیا۔

"دیکھو تو ـــــ"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ــــ"

تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے۔ رنگ پر رنگ دوڑتے رہے۔ مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ رانی نے لمبی سی سانس لی۔

"ہا ــ بس چودھری ـــ ہو گئے چھ منٹ"

"ہوں ہنک ـــ" وہ جلدی جلدی کبھی اُسے اور کبھی ادھ بنی دھبوں والی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"سردی لگ رہی ہے۔ چدر اوڑھ لوں ــــ"

"نہیں ـــ"

"آ ـــ آ ـــ ئے ـــ جاڑا ـــ" وہ کتوں کی طرح رونے لگی۔ چودھری چپ ـــ

"کمر ـــ کمر ـــ میری کمر رے ـــ چودھری جی ـــــ"

اصل میں آج وہ شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

چدر ـــ چدر ـــ میری چدر ـــ"

چودھری چپ ـــ

"ہوں ـــ کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈیا پٹخی ہوں ہاں نہیں تو ـــ" چودھری جلدی سے مڑا وہ یہ تصویر مکمل کرنے کے لیے ہنڈیا عجائب خانے سے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھ لو رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی ـــ جوں کاٹ رہی ہے چودھری ـــ وہ اپنے

گھنگھے ہوئے بالوں کو الجھانے لگی۔ اور وہ پھولدار مشکی پیچھے ٹکا دی۔

چودھری نے پیر دور دور رکھ لیے آنکھیں گھما کر لٹو کی طرح باہر نکال لیں اور غصے سے اُس کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اُس کی چکبری چھدری ڈاڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید سفید بادبان ہلتے ہیں۔ اور اُس کی گنجی چکنی کھوپری پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیٹے لیٹے کمر تو دُکھ گئی ــــ" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کر لی ــــ اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"او ہو ــــ ہو ــــ ہو برررر ــــ" وہ ہونٹ بجا بجا کر دُکرائی۔

"ڈ ــــ دو ــــ دو ــــ کوئی مر بھی جائے تو بھی ــــ رُو رُو ــــ بررر ــــ"

چودھری نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورا ــــ جب کبھی بھی وہ رونے لگتی تھی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھدکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا۔ اور برش ہاتھوں میں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے طشتری کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اُسے کچھ نہ سوجھتا۔ اور یہ کرب کی حالت اُس پر جب تک طاری رہتی جب تک اس کے دماغ میں چبھتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا۔ اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹے نہیں بھالے بن کر اُس کی ہستی کے آر پار نکلی جا رہی تھیں۔

ہر ذی روح پر چودھری کے اس دورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا چنانچہ رانی نہ رُک سکی۔ اُس نے پھر اپنے پیٹ کو اندر پچکایا اور ہونٹوں سے پھرکنی کی سی

آوازیں نکالتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک، دنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش سپاٹ بھرتا رہا۔ رنگ کی تھالی گندی اور بدشکل ہوتی گئی لیکن ——

"چودھری۔" اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا۔ دنیا کے محور کا ایک پایہ ذرا اچکا —— جانے بھئی محور میں پائے لگے ہوتے ہیں یا نہیں ——؟ لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے یہ دیکھا ہے ——"

چودھری کے کندھے جھرا جھرائے۔ اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے دانے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی!

"یہ دیکھو —— یہ کالا تل! —— یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے —— اور نیچے —— ذرا الٹی طرف ——" ایک ہاتھ سے پھولدار مٹکی پکڑ کر وہ ہونٹ لٹکا کر اپنی گردن سے نیچے جھانکنے لگی۔

"دیکھا ہے یہ —— تل —— اور —— تم تو دیکھ رہے ہو چودھری۔" بن کر شرمانے لگی۔ "واہ! مجھے شرم آتی ہے۔"

"سیدھی بیٹھ ——" چودھری غرّایا۔

"اوں —— بڑے آئے —— بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا اور جب وہ ایسی بُری جگہ ہو —— ہی —— ہی ——" وہ اترائی —— "بُری جگہ ہے —— تل —— تم نے دیکھ تو لیا۔ بولو ——"

"میں نے تل ول کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں" —— بدمزاجی بڑی

"ہوں — جھوٹے — سراسر کانڑی آنکھ کر کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور — ہی — ہی —" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اِٹھلائی

"رانی!"

رانی نے صرف ناک اُچکا دی۔

"چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے خالی ڈبے پر بیٹھ گیا —
"تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں —"

"ہائے رام — گوئی ... کتنے بڑے؟" وہ بھی مٹکی مٹکا کر آگے جھک گئی۔

"میں تیرے باپ بلکہ دادا برابر ہوں — اور تو — تو بتا تو کتنی ہو گئی؟ — پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بد معاشی کی باتیں کس نے سکھائیں"۔ چودھری دادا برابر تو کیا اُس کے باپ برابر بھی نہ ہو سکتا تھا ذرا معاملہ کو دبانے کے لیے کہہ دیا تھا اُس نے۔

"اوں — بد معاشی کی باتیں تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو — ایسی بری جگہ تو تل ہے —" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

"ذرا سی چھوکری —"

"ذرا سی چھوکری — ذرا سی کا ہے سے ہوں واہ — ذرا سی کہتے رہتے ہو — ذرا سی ہوتی تو —"

"تو؟ — تو — تو کیا؟"

"رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر یہ تل ہوتا ہے وہ — وہ —"

"رتنا؟ — یہ رتنا کو کیا معلوم تیرے کہاں کہاں تل ہیں —"

میں نے دکھایا تھا ــــــ" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

"تو نے ـــــــ تو ـــــــ تو ـــــــ تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل ــــ"

چودھری کا پھر خون کھلبلایا اور بغلوں میں چوہے پھدکے اور گالوں کا گوشت ہلا ــــ پھر برش پھلجھری کی طرح تھرکنے لگے اور رنگ ملنے شروع ہوئے

"آ ــ تو ـــــ واہ ــــ اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی ـــــ"

"کیسے، کیسے دیکھ لیا ـــــ تل اس نے جبکہ تو ــــــ" چودھری کی بتیسی ڈھیلے کواڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہا رہی تھی میں تو اُس نے ـــــ اُس نے مٹکی سنبھالی اور نشست پر بیٹھنے لگی

"تو نہا رہی تھی ــــ اور ـــــ وہ آگیا ــــ حرامی پلا ـــــ"

"ہاں تلیا پر نہا رہی تھی ـــــ مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے اس لیے میں اُسے سنگ لے گئی ـــــ کوئی آجاتا تو ـــــ میں نہا رہی تھی شلوکہ بھی دھویا ـــــ"

"مجھے ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے اس لیے تو اُسے لے گئی ــــــ"

"ہاں ـــ" اُس نے بھولپن سے فیصلہ کیا۔

"رانی ـــــ" وہ آگے بڑھا ـــــ

"آں ـــ میں نے اس سے کہہ دیا تھا اُدھر منہ رکھیو ـــــ مگر ـــــ

"مگر؟ ـــــ"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا ـــــ پھر میں نے کہا رتنا میرے تل ہے بڑی

بُری جگہ ——" وہ بولا نہیں تو، میں نے کہا تو نہیں دیکھتا تو مت دیکھے
—— ہاں بھئی مجھے کیا ؟ —— کیوں چودھری ——" ؟
" پھر تو کیسے کہتی ہے اُس نے تِل دیکھا ؟"
" ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی اِتنا اِتنا گہرا تھا۔" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔
" قطامہ !" چودھری برش پھینک کر لکڑی کی طرف چلا ——
" ہائے رے رام —— پھر —— پھر سنو تو —— چودھری ——
تو کیا میں ڈوب جاتی۔" ؟
تجھے تیرنا نہیں آتا —— کتیا ؟ رات دن ہودی میں جو ڈبکیاں لگاتی تھی تب نہ ڈوب مری ——"
" واہ —— واہ میں کیوں ڈوبتی —— میں —— میں —— تو تل دکھا رہی تھی ——"
" تو نے تل دکھانے کے لیے بہانہ کیا تھا —— ؟" چودھری نے پتلی سی قمچی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔
" ہائے رام —— مجھے —— دھوتی تو اوڑھ لینے دو —— چودھری جی"
وہ بندریا کی طرح اُچک کر کھاٹ کے اوپر جا کھڑی ہوئی۔
" جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری، پھر مجھے شرم آئے گی —— میں کہہ دوں گی چودھری —— چودھری ——" بڈھا رک گیا —— کیا کہہ دے گی ——"

"میں کہہ دوں گی چودھری کہتا ہے کہ — یہ راتیں — ام ام —"

"چلی جی"! چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناچ اُٹھا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیر نشانے پر بیٹھا!

"سب سے کہہ دوں گی — سنا چودھری؟ مارو تو تم مجھے — مار کے بھی دیکھ لو — واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو — اتنی تو چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری — بڑے خراب ہو تم جی —" وہ ہلکے ہلکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا۔ اُٹھ کر تصویریں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوٹے کہ قیمہ بنا دے مگر پھر اُسے وہ نمائش یاد آگئی جس میں اسے پانچ ہزار کا انعام ملنے والا تھا۔

ایک تو اُس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویر تو بنانے لگا تھا۔ اور ہزاروں ہی تصویریں بنا کر چھوڑ دیں۔ اُس نے کھلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ ٹھٹھ مارتا ہوا سبزہ ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اُس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھا دیا تھا۔ دور دور کے ملکوں کی ننگی اور آراستہ پیراستہ عورتیں بھی اُس کے سامنے گھنٹوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ چلبلی گنوار چھوکری جسے اُس نے موری کی غلاظت سے اٹھا کر اپنے آئندہ شاہکار کے لیے چنا تھا۔ اُس کے قابو میں نہ آئی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اُس کے جسم جیسا مسالہ نہ تیار کر سکا اس نے سیاہی میں صندلی گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ

ملا دیا پھر بھی اُس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی۔ نیلی اور کچھ بادامی لہریے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سُرخی پھوٹنے لگتی ـــــ اور پھر کبھی بالکل اچانک اُس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اُودی اُودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا۔ اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی۔

اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اُس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کر لیا ـــــ لیکن پھر اُسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے ـــــ خیر وہ بھی ہُوا، پھر اُن ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سا رنگ بے کار کیا۔ لیکن اُس کے غصّے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں ـــــ اور ہوتے ہوتے دو زمرّد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے ـــــ اُف! وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا ـــــ اور اوپر سے یہ باتیں۔

"مچھر کاٹ گیا ـــــ" وہ بچوں کی طرح منمنائی

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھنٹی سادہ جائے گا اور بولے گا ہی نہیں۔

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں ـــــ یہ مچھر ـــــ" چودھری چُپ!

"ہائے رے کیسے کاٹتے ہیں ـــــ یہ مچھر ـــــ" اُس نے موٹی سی ایسی

بازاری گالی بکی جو کچھ عام بھی نہیں۔

چودھری اچھل پڑا! گالی۔ یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے! وہ خود سوائے چند بالکل زبان زد گالیوں کے ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا۔ اُس نے کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا۔ اور یہ گالی تو شاید داروغہ جی کو بھی نہ آتی ہوگی۔ وہ بھی صرف چند مخصوص الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں محض ضرورتاً!

"یہ تو نے گالیاں کہاں سیکھیں؟" وہ مڑ گیا۔

"کونسی ــــ یہ ــــ" اس نے پھر بولپن سے گالی دہرائی

"رانی!" وہ بھبکا!

"چنن نے دی تھی ایک دفعہ مچھروں کو ــــ اس کی کھولی میں بھی بہت مچھر ہیں ــــ" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اس کی کھولی؟ ــــ تو اُس کی کھولی میں بھی گئی تھی ــــ"

"ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گڑدھانی کھائے گی۔"

"پھر گڑدھانی کھائی تو نے؟"

"کہاں؟ گڑدھانی تھی بھی نہیں، جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اب لا دیتا ہے۔"

"تجھے چنن گڑدھانی لا دیتا ہے ــــ"

"ہاں اور کھیلیں" وہ شکی پر نقش ونگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں ــــ"! چودھری جانتا تھا کہ وہ بےکار حیرت زدہ ہو رہا ہے رانی گڑدھانی پر فریفتہ تھی وہ چنن کی کھولی چھوڑ موری میں کتے کے جبڑوں میں سے

گڑدھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دیئے پھر بھی چتن کی گڑدھانی لیتی ہے"

"ادں میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں۔ وہی دیتا ہے کہتا ہے چل کھولی میں —— مجھے تو وہ اب برا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں —— مجھے تو چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خون —— خون ——" وہ ناک سکیڑ کر پھڑپھڑانے لگی جیسے کسی نے اس کی ناک میں بتی کر دی ہو۔ "ذرا پیٹھ کھجا لوں —— چودھری ——" پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیتیں چھانے لگیں۔ بھیجے میں تالیاں سی بجنے لگیں اور گال اوپر نیچے کودنے لگے پانچ ہزار روپے کھنن کھنن اس سے دور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ ناچ کر بھاگنے لگے۔ بھورا کالا سرمئی اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست بہ گریباں ہونے لگے۔ اور کھوپڑی پر آبلے سے ابھر آئے۔۔

اب سوال یہ تھا تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب وہ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باولے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبوئے۔ یونہی اس کے قدم تلیا کی طرف اٹھ گئے۔ تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطح آب پر تھرکتے ناچتے دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اُدہ وہ شاعر تھا —— پیدائشی شاعر۔ وہ دنیا میں تو رہتا تھا مگر دنیا سے کتنا دور، بڈھا تو وہ نہ تھا —— مگر جوان بھی اسے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ اس نے داڑھی

لاپروائی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی اور وہ کچھ یونہی سی چتکبری ہو چلی تھی۔

"اوہ!" پھر اُس کی بغلوں میں کوئی چیز پھڑپھڑائی ـــــ رانی کے ہنسنے کی آواز ایک بھرائی ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہو گا ـــــ اور کیا۔ برسات ـــــ خیر برسات تو دور تھی ـــــ مگر نہیں مینڈک نہیں بلی خرخرائی ہو گی ـــــ بی تو کیا ہاں کچھ ہو گا ضرور ـــــ

لیکن جب اُس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے سنگ پانی میں چُہلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا تخیل اُسے چھیڑنے کے لیے نئے نئے بہانے تراشا کرتا تھا۔ اور آج تو حد کر دی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رُک گئے اور دو حیرت زدہ سنگ موسیٰ کے سے مجسّمے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا واہمہ! بالکل بال بال صاف، رتنا کے پٹھوں کا ابھار پانی سے بھیگی ہوئی اُس کی لمبی چوٹی ـــــ قریب قریب بیٹھی ہوئی دو آنکھیں ـــــ اور رانی کی اُلجھی ہوئی چوٹی ـــــ وہ سرمئی غبابی صندلی کافوری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور تل! ـــــ

وہ تل! اُبھرا ہوا ـــــ گولی کی طرح چودھری کے سینے میں آ کر کھٹ سے لگا ـــــ ایک طرف کو سر کتا بچتا رتنا تو نکل گیا۔ اور بھاگا دھوتی اُٹھا کر۔ اور رانی ڈھیری سے کھڑی چپ چپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کوئی اُسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہو۔

"تل دیکھ رہے ہو میرا ـــــ بڑے بڑے ہو جی ـــــ" وہ منانے کے لیے اٹھلانے لگی۔ چودھری شکر ہے کہ کھڈ کے کنارے آ کر سنبھلا۔

"باہر نکل — !" اس نے اس ننھے چودھری کو پرے دھکیل کر کہا۔
جو دھیمے دھیمے ڈوبتا جا رہا تھا۔
"اوں تم مارو گے —" وہ پانی میں سے اوپر ابھر آئی۔
"آج تجھے ادھیڑ کر نہ ڈال دیا ہو تو میرا نام چودھری نہیں —" چودھری نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی تو چھوکری تھی جو کیچڑ میں بھینڈ کی طرح پل رہی تھی۔
"عورت پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئے گی؟ —" چودھری سنک گیا
"ننگی عورتوں کو پیٹتے ہو؟ — واہ —" وہ اور اوپر ابھری —
"شرم نہیں آتی —" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پانی اس کے ٹخنوں تک آرہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اسی لیے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔
"اوں — جاؤ —" وہ شرمانے لگی۔
"چودھری کے ہاتھ سے وہ لچکتی ہوئی پنچی گر گئی۔ اور اس کا قد کئی انچ لمبا ہو گیا۔ اس کے بازو پھول گئے اور بھیجے میں سُرسُریاں سی رینگنے لگیں — بھوبل کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سیاہ آندھی بہالے گئی۔ اور چنگاری بھڑکی — دھڑ دھڑ دھڑ — شعلے لپکنے لگے — اس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ ابھرے ہوئے تل پر جھپٹیں اور — اوہ گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر اپنے کمرے میں پلنگ کی طرف۔ اسی دن اس نے رتنا کو نکال دیا — وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی چیز اس کے جسم میں

برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھی ——— مگر سوراخ ہو ہی نہ چکتا تھا ———
جیسے کوئی چٹان راستے میں آ گئی ہو ———

آج اُسے اپنی تصویروں میں لگانے کو رنگ مل رہے تھے اکٹھی میں
ذرا سی نیلاہٹ ملا دینے سے بالکل وہی ——— وہی بھیگا ہوا سمندر کی تہ جیسا
گہرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا ——— اور آنکھوں کے لیے بھی بس سیاہی میں
ہلکی سی سبزی ——— نہیں اُودا ہٹ یا شاید سرمئی رنگ اور پھر گلابی کوٹ
——— جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔ اُس نے چاہا آئینے میں اپنی صورت
دیکھے۔ لیکن آئینہ تو جانے اُس نے کب سے نہیں دیکھا تھا ——— ایک
مصور کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لیے
ہوتا ہی کیا ہے ؟ اُس کا آئینہ تو وہ ساری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ
اُس کی روح کا کونا کونا نظر آتا تھا۔ اُس کا دل اور دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں
میں سمویا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اس نے چاہا کہیں اپنی صورت دیکھے ! اُس نے ایک ٹین کے
ڈبے کو جس میں اس کے رنگ دُور دور کے شہروں سے آیا کرتے تھے اُلٹ کر
جھاڑا ——— دو جھینگر پھدک کر اُس کی ناک پر ٹہوکا کھاتے اڑ گئے ———
مکڑی کا جالا اُس نے کہنی سے جھاڑ کر اُس میں اپنا منہ دیکھا ———

پہلے تو اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— جیسے سمندر کی تہہ میں باریک باریک
جھاڑ اور پھندنے سے ہوتے ہیں ——— یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھس جاتی
ہیں تو پھیلا پھیلا دکھائی دیتا ہے ویسا دکھائی دیا ——— پھر ایک بھیانک ڈاڑھی

اور پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں —— اوہ یہ وہ خود تھا! وہ؟ وہ ——
جو —— مگر ایسا تو کبھی تھا ہی نہیں —— ایسا؟ اُس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا دیا
اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے ڈاڑھی تو خیر نظر
آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دھبے والی ناک اور پھولی ہوئی
مونچھ دکھائی دی ——

مونچھ! —— اگر قینچی ہوتی تو وہ —— ذرا —— ذرا سا مونچھ کو
ویسا کر دیتا —— رانی کہتی تھی جین کی مونچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں ——
فوں —— فوں —— وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رتنا لنگوٹ
پہنے تھا —— کیا عجب دھوتی بھی ہو —— پہنے ہو —— یا پہننے والا ہی ہو کہ
وہ آ گیا —— مگر یہ جین اور اُس کی گرد ہانی!

اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گرد ہانی کی بنی ہوئی ہیں
اور وہ اُسے بھینچے ڈال رہی ہیں —— وہ ایک پسی ہوئی مکھی کی طرح گرد ہانی
کے ایک بڑے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا
اور ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ اسٹول پر ٹک گیا —— پروہ ہٹا کر اُس نے اپنی
ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے
اور ایک دم ٹھہر گئے —— شانے پالش کیے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے
لگے اور آنکھوں میں نیلی ہری کالی روشنیاں گھومنے لگیں —— اور تل!

یہ تل کہاں سے آیا —— سانپ کی طرح گول کنڈلی مارے ابھرا ہوا تل!
ٹِک ٹِک۔ ٹک ٹک گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اُٹھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھری کی طرف اُٹھ گئے گندی میلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹی ہوئی کوٹھری! وہ کل ہی اسے اونچا کرائے گا ــــ نہیں ــــ اونچا نہیں ــــ وہ جو دوسرا کمرہ ہے جس میں خالی ڈبے پڑے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا ــــ اس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔ کوٹھری کی سیاہی کھلی ہوئی کالونچ کی طرح اس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرائے اور ــــ پھر بان کے جھولے میں دھنس گئے ــــ اُس نے جلدی جلدی سارا پلنگ ٹٹول ڈالا مگر رانی وہاں نہ تھی!

سارے بدن پر جیسے مچھروں نے لپٹ کر چٹکنا شروع کیا ــــ موٹے موٹے، قہقہے لگاتے ہوئے مچھر! ــــ اور پھر گردوہانی کی سیلیں کی سیلیں اُس پر ٹوٹ پڑیں۔

صبح اُس نے چاہا رانی کی چٹیا اَمٹیا کر اُس سے پوچھے حرامزادی یہ رات کو کہاں گئی تھی ــــ مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اُس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے۔

وہ چپکا کام کرتا رہا اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے شاید رات کے اُڑنے کا کچھ پتہ چلے مگر وہ منھ بنائے روٹھی بیٹھی رہی۔

"کیوں کیا تھک گئی؟ ــــ" اُس نے اُسے مٹکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔ آج وہ اس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔

"اور کیا ــــ میں مٹی کی بنی ہوں؟ ــــ" وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے

دبانے لگی۔

چودھری کا جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے۔ مگر اُسے اپنا انداز بدلتے ذرا شرم آئی۔

"لے بس اب ستا چکی ——" وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ لڑے گی اور —— خیر۔ مگر رانی نے مٹکی اُٹھا کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تنتنا اُٹھے۔ جو رنگ لگایا مُنھ چڑانے لگا —— آج اُس نے سوچا تھا تِل بھی بنا دے گا۔ یونہی —— تصویروں میں کیا تِل نہیں ہوتے مگر رنگوں کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا ——

جب رانی اٹھ کر چلی تو گڑوہانی کا ٹکڑا اس کی دھوتی میں سے گر پڑا اُسے خبر بھی نہ ہوئی مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے سر پر سائبان ٹوٹ پڑا۔

"یہ —— گڑوہانی ——!" اُس نے غصّے سے جھاگ اُڑانے شروع کئے۔ پہلے تو وہ رُکی کہ اٹھا لے۔ مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھاؤ ——" اُس نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا۔

چودھری پر پھر مگھٹ کا بھتنا سوار ہو گیا —— وہ رانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا —— اور پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اُس نے گڑوہانی کو زمین پر رگڑ رگڑ کر پیس ڈالا ——

دوسرے دن رانی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس نے دو چار کپڑے لینے کی تکلیف بھی تو گوارا نہ کی۔ جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر مُوت کیچڑ میں

رُلنے کے لیے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی! پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اُس کے دماغ پر جم گئے ——— سیاہ دھبّہ جیسے ننھّا سا اُبھرا ہوا تِل ——— مگر کتنی بڑی جگہ تھا یہ سیاہ جلا ہوا نشان ——— بالکل چودھری کے کلیجے میں؟

اُس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا ——— ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی۔ اُسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہے نہ کہ آخر بھاگ گئی تو کیا ہوا۔ وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لہٰذا دن گذرتے گئے، وہ تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چھ چھ آنے میں بھی اُس کی تصویریں نہ لیتا تھا کیونکہ وہ اس قدر بھدے ڈراؤنے سیاہ بھورے اور کالے رنگ شفق اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اُسے اُلّو سمجھتے تھے اُس کے سارے رنگ گڈمڈ ہو کر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔۔ لوگ رانی کے متعلق اس سے بار بار پوچھتے، وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے ہیں؟

"چودھری رانی کو بیچ آیا۔"

"ایک سوداگر آیا تھا سو کئی ہزار دے کر لے گیا۔"

"رانی سے بُرا تعلق تھا ——— ناجائز ——— کہیں پار کر دیا ———"

جتنے منہ اس سے دونی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھری

بن گئی۔ معلوم ہوتا تھا دنیا اُسے تل کے کھانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں، لطف زندگی
تو جب آیا جب رانی ایک چھوٹی سی خون آلود گٹھڑی ایک الگ سے
راستے میں رکھتی ہوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی
—— اور چودھری کے رہے سہے حواس گم ہو گئے۔ رانی کے غائب ہونے کا
عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا اور چودھری ہکا بکا منھ پھاڑے رہ گیا
—— اُف اُس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی یوں ناانصافی اور
اندھا دُھند کے ہاتھوں کچلی گئی —— مگر وہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا
اس سے بیر نہیں، وہ ایسے صاف بچ جائے گا جیسے —— جیسے سب بے گناہ
بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں —— مگر کاش وہ شریک جرم ہی رہتا
—— تو پھر وہ مجرم ہی رہتا —— یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اُس نے پیدا ہو کر
کونسا کم جرم کیا تھا۔

ہاں تو کاش وہ شریک جرم رہتا —— قید بھگتتا —— مصیبتیں دکھ
درد بیتتا —— دنیا بھر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں
لپک لیتا اُسے پتہ ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے
سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا مانگتا —— ہاں یہ تو تھا کہ ——
ذرا تِل —— ہاں۔ خیر! مگر خدا کیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔
اُسی نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں —— مگر اُسے کیا
معلوم تھا کہ جب رانی سے باز پرس ہوگی اور سرکاری وکیل چاروں طرف
سے چودھری کو منطق کے جال میں گھیرے گا تو وہ یہ داؤں چلے گی ——

اور یوں اُسے آزاد ــــ یا دوسرے معنوں میں برباد کر دے گی۔

"چودھری کا نہیں تھا ــــ" اُس نے بھری کچہری میں حلف اُٹھا کر کہہ دیا۔

"چودھری تو ہیجڑہ ہے ــــ" اس نے لا پروائی سے کہا ــــ "رتنا سے پوچھو یا چنن سے ــــ اب مجھے کیا معلوم ــــ واہ ــــ" واہ اپنی پرانی ادا سے اٹھلائی۔

ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر پھٹا اور دور ــــ سیاہی میں اور بھی سیاہ گول ــــ ابھرا ہوا نقطہ پھرکی کی طرح گھومنے لگا ــــ!

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے بیٹھا کوئلے سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے۔ کبھی تکونی ــــ گول ــــ جیسے جلا ہوا داغ ــــ!

کرشن چندر

ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر ایک ساحر ہے۔ اس کے انداز بیان کی لطافت اور شوخی۔ سلاست اور گہرائی افسانہ نگاروں کی نئی پود میں منفرد حیثیت رکھتی ہے "جہلم میں ناؤ پر"۔ "آنگی" اور "جنت و جہنم" لکھنے والا ہر دلعزیز افسانہ نگار، کو عرصے کے لیے کسی پابندی یا ذہنی اضطراب کے باعث اپنے مخصوص رنگوں کو پھیکا کرنے پر تُل گیا تھا۔ لیکن "ٹوٹے ہوئے تارے" نے اس کی عظمت کا سکّہ بٹھا دیا۔ یہی وہ افسانہ ہے جس میں کرشن چندر کی تمام خصوصیات اجاگر ہیں۔ پلاٹ اس کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ کردار نگاری اور فرد کی نفسیات اُس کے فن کا منتہائے آخری ہیں۔ "ٹوٹے ہوئے تارے" ایک امیر نوجوان کے ذہنی افلاس کا تجزیہ ہے۔ اور گو وہ نوجوان شبانہ خام کاریوں کے بعد ہر صبح اپنے منھ کا ذائقہ کسیلا محسوس کرتا ہے۔ لیکن پڑھنے والے کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے، کرشن چندر سماج کے ناسوروں پر نشتر چلاتا ہے ___ مگر ایک طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ ___ یہی اس کے فن کی بلندی اور پاکیزگی کا راز ہے

رات کی تھکن سے اُس کے شانے ابھی تک بوجھل تھے۔ آنکھیں خمار آلود اور لبوں پر تریٹ کے ڈاک بنگلے کی بیئر کا کسیلا ذائقہ، وہ بار بار اپنی زبان کو ہونٹوں پر پھیر کر اُس کے پھیکے اور بے لذت سے ذائقے کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو اُس کی آنکھیں مُندی ہوئی تھیں۔ لیکن پہاڑوں کے موڑ اُسے اس طرح یاد تھے۔ جیسے الف بے کی پہلی سطر، اور وہ نہایت چابکدستی سے اپنی موٹر کو جس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے (ایک آدمی اور غالباً ایک عورت) ان خطرناک موڑوں پر گھماتے لے جا رہا تھا۔ کہیں کہیں تو یہ موڑ بہت خطرناک ہو جاتے، ایک طرف عمودی چٹانیں، دوسری طرف کھائی، جس کی تہ میں جہلم کے نیلے پانی اور سفید جھاگ کی ایک ٹیڑھی سی لکیر نظر آ جاتی، انھیں موڑوں پر سے تو کار کو تیز چلانے میں لطف حاصل ہوتا تھا، سارے جسم میں ایک پھریری سی آ جاتی تھی۔ صبح کی ہوا ابھی برفیلی اور خوشگوار تھی، اس میں اونچی چوٹیوں کی اوڑون گھاٹیوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں کے جنگین کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ کیسی انوکھی مہک تھی، عجیب بے نام سی، تر و تازہ نہالو کے لبوں کی طرح، وہ اپنی نیم وا آنکھوں کی پلکوں کے سائے میں پچھلی رات کے بیتے ہوئے طربناک لمحوں کو واپس بلانے لگا...... بیئر کی رنگت میں ڈوبتے ہوئے سورج کا سونا گھلا ہوا تھا...... اس کے کسیلے پن میں

ایک عجیب سی لطافت تھی۔۔۔۔۔۔۔رات کی بھیگی ہوئی خاموشیوں میں
دُور کہیں ایک بلبل نغمہ ریز تھی۔۔۔۔۔۔بلبل نے اپنے نغمے میں خاموشی اور آواز
کو یوں ملا دیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے
تھے، اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ یہ خاموشی کہاں ختم ہوتی ہے۔ اور یہ موسیقی
کہاں شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔چاندنی رات میں سیب کے پھول ہنس
رہے تھے۔ اور نہالو کے لب مسکرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔وہ لب جو بار بار چومے
جانے پر بھی معصوم دکھائی دیتے تھے ——— ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اُنھیں نہیں چھو سکتی، کیسا عجیب احساس تھا۔
اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں پیچھے رہ گیا تھا۔۔۔۔۔۔رات کی تنہائیوں میں
نہالو کا حسن غیر فانی اور غیر زمینی معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔اس کے لب اُس کی
آنکھوں کی ترچی، اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی
اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چٹکتے ہوئے غنچے، جیسے رات کی بھیگی ہوئی
خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے، اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں
شروع ہوتی ہے اور یہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔لیکن اب تو وہ
ڈاک بنگلہ بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور اس وقت کسی پرستانی قلعے کی طرح معلوم
ہو رہا تھا۔ موڑوں کے الجھاؤ میں کار گھومتی ہوئی جا رہی تھی، اور اُس کے
تخیل میں نہالو کے لب اور جنگل کی مہک اور بلبل کا نغمہ اور بیر کا سہرا رنگ
چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی سڑک پر اُلجھتے گئے، نیچے جہلم کا پانی وحشی
راگ گانے لگا، اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر جھپانے لگے

اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کی وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اڑا کر لے جائے، یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھل گئیں۔

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اُس نے اپنی کار ٹھہرا لی۔ اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا، آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا، ایک پہاڑی گیت گنگناتا رہا اور پانی لے کر کلیاں کرتا رہا، آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں میں رچا ہوا خمار دُور ہو گیا اور بیئر کا کسیلا ذائقہ بھی جاتا رہا۔ اب لب سوکھے تھے۔ آنکھوں میں جلن بھی محسوس ہونے لگی، پیاس اور اشتہا بھی، اُس نے بوتل کھول کر گرم چائے انڈیل لی اور سرو توس پر مکھن لگا کر کھانے لگا، بدن میں گرمی اور قوت آرہی تھی شانوں کی تھکن معدوم ہونے لگی۔ اب وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں، موٹروں اور لاریوں کو غور اور دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس وادی میں بیکانیر کے مارواڑی اپنی بھاری بھرکم بیویوں کو پہلگام سیر کرانے کیلئے لے جا رہے تھے، ایک یوریشین کار چلا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی بیوی کی کمر پر تھا۔ جو اپنے لبوں پر سُرخی لگانے میں مصروف تھی، اس لاری میں بیمار کلرک اور ان کی ادھ موئی بیویاں بیٹھی تھیں، اور اُن کے بے شمار بچے لاری کی کھڑکیوں پر کھڑے غل مچا رہے تھے......اس لاری میں سکھ ڈرائیور کی پگڑی ڈھیلی ہو چکی تھی، اور وہ اونگھتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اُسے خیال آیا کہ چند میل آگے جا کر یہ سکھ ڈرائیور اپنی لاری کو کھائی کی وسیع خلا پر اُڑانے کی کوشش کرے گا۔ اور پھر دوسرے دن وہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھ لے گا۔" مری کشمیر روڈ پر ایک حادثہ"

لاری جہلم میں جا گری، سب مسافر جہلم میں غرق ہو گئے، ڈرائیور بال بال بچ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاری موڑ پر سے گذر گئی۔

اسی لاری میں بیٹھے ہوئے لوگ جن میں پنجاب کے چند پہلوان بھی شامل تھے، بہت خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔ اس خوشی میں غالباً کشمیر کی ناشپاتیوں اور عورتوں کی نرمی اور گداز پن کا بہت حصّہ تھا۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ چند میلوں پر جا کر اُنھیں موت سے مقابلہ کرنے کے لیئے اپنی پہلوانی کا ثبوت دینا پڑے گا، اور یہ کہ تھوڑی دیر ہی میں وہ عورتوں کی طرح چیخیں مارتے اور کھائی پر ناشپاتیوں کی طرح لڑھکتے دکھائی دیں گے۔ ۔ ۔ ۔ اس لاری میں چند ریشمیں برقعے سرسرا رہے تھے لیکن کئیوں نے نقاب الٹ دیئے تھے۔ ایک بدصورت عورت نے جو ایک نہایت خوبصورت برقعہ پہنے تھی زور سے پان کی پیک سڑک پر پھینکی اور چند چھینٹیں اُڑ کر چشمے کے قریب آ پڑیں اور وہ پرے سرک گیا۔ تین ہاتو، اپنے گھٹے ہوئے سروں پر تنگ ٹوپیاں پہنے اور کاندھوں پر نمک کے بڑے بڑے ڈلے اٹھائے گزر رہے تھے، اُن کے نتھنے پھولے ہوئے تھے، اور گال سُرخ، اور چپٹے پاؤں میں پیال کی چپلیں تھیں۔ اُسے وہ ضرب المثل یاد آئی "کشمیر میں جا کے ہم نے دیکھی ایک عجب بات، عورتیں ہیں مثلِ پری، آدمی جن ذات۔ ۔ ۔ ۔ ۔" دو گوجریاں، جوان، سانولی سلونی، گدرائی ہوئیں، جیسے رسیلے جامن، تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے گزر گئیں۔ ایک ڈرائیور نے اپنی لاری چشمے کے کنارے ٹھہرائی اور انجن اور پہیے ٹھنڈے کرنے لگا۔ لاری میں ایک موٹے سیٹھ کا موٹا کتا اس کی طرف دیکھ کر

بھونکنے لگا۔ "ٹامی شٹ اپ، ٹامی شٹ اپ،" موٹے سیٹھ نے کئی بار کہا لیکن کتا نہ رکا اور لاری کے موڑ پر گزر جانے تک بھونکتا رہا۔

اب سورج صبح اور دوپہر کے درمیانی وقفے میں آ گیا تھا، اور اُس نے چلنے کی ٹھانی، اُس نے سوچا کہ آج رات وہ چوبیس میل کے ڈاک بنگلے میں قیام کرے گا۔ گرمی تو وہ آج رات کسی طرح نہ پہنچ سکتا تھا، اُس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف و شفاف پانی پینے کے لیے بھرا اور پھر رک گیا، خاموش قدموں سے ایک عورت اُس کے قریب آ گئی تھی، نوجوان سی، اور کچھ فربہ اندام، اُس نے نیلے پھولوں والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی، اور اُسے سیاہ قمیص پر اُس کی ابھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آئے، اور چشمے کا صاف و شفاف پانی اُس کی اوک سے باہر چھلکنے لگا، اور کچھ عرصے کے بعد اُس کی اوک خالی ہو گئی۔ اور اُس نے اُس سے پوچھا، "پانی پینا چاہتی ہو؟" لیکن اُس کے نیلے پیاسے سرخ لبوں کی طرف دیکھ کر اسے اپنا سوال بے معنی سا معلوم ہوا۔ عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی رہی، اور اُس کی پیاس تیز ہوتی گئی ...... عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے اور کانوں کے قریب بل کھائی ہوئی زلف بھی، اور پھر یکایک دونوں کی نگاہیں ملیں، عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کیے۔

اُس نے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا۔ "میں نکڑ میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں"

"بلند کوٹ کدھر ہے؟"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی، پھر آگے جنگل سے ایک راستہ اور پہاڑ کی طرف چڑھتا ہے۔ وہ راستہ ہمارے بلند کوٹ کی طرف جاتا ہے۔ بہت اونچی اور سرد جگہ ہے۔"

تو پھر تم وہاں کیوں رہتی ہو۔ یہاں دیکھو کتنا خوش گوار موسم ہے، اس چشمے کا پانی کتنا ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔"

عورت نے ہنس کر کہا۔ "ہم بکروال لوگ ہیں، ہم بھیڑوں، بکریوں بھینسوں کے گلّے کے گلّے پالتے ہیں۔ آج کل ان اونچے علاقوں پر بہت عمدہ ہری ہری گھاس ہوتی ہے۔ جو برف کے کھل جانے پر پھوٹتی ہے۔ اس باریک، نرم اور ہری دوب کو ہمارے مویشی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اور چشمے تو وہاں اس سے بھی زیادہ ٹھنڈے اور میٹھے ہیں۔

اُس نے بات کا رخ بدل کر کہا۔ "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہے؟"

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو سال"

وہ اپنا رخت سفر باندھنے لگا، عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں ابھی تک لٹک رہی تھیں۔ اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی۔

اس نے کہا۔ "تمھاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں۔" اور پھر وہ یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں اور اس نے آہستہ سے کہا، "آؤ، تم

میری کار میں بیٹھ جاؤ۔ کم از کم سات آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔"

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عورت ہچکچائی۔ لیکن موٹر کا دروازہ کھلا تھا اور اس نے اُسے اندر دھکیل دیا، اور پھر کیا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لیے نہ بنائی گئی تھی؟ ایک مرد اور غالباً ایک عورت، اور اُس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اُس کی کمر پہ رکھدیا، عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی۔ جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں۔ موٹر بھاگتی گئی اور اُس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ اور سمندر، جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں۔ اور وقت سٹ جاتا ہے۔ . . . . .

جب وہ چومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچا، تو ہر طرف شام کی اداسی چھارہی تھی۔ سامنے کا سیاہ پہاڑ کسی وسیع قلعے کی دیوار معلوم ہو رہا تھا، اور درختوں کی چوٹیاں پہرے دار کی بندوقیں۔ اب وہ پھر اکیلا تھا، اُسے اپنے آپ سے قلعے کی دیوار سے، پہرے داروں کی بندوقوں سے، فضا کی تنہائی سے ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ سے ڈر، اُس تیرگی سے ڈر، جو اُس کی روح پر چھائی ہوئی تھی، رات کے گہرے سایوں کی طرح، جیسے وہ اسی افسردگی کے دلدل میں اندر ہی اندر دھنسا جا رہا ہو، اُس نے ڈاک بنگلے کے بیرے کو آواز دے کر کہا "ایک وائٹ ہارس کھول دو۔" اور پھر اُس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جانِ عزیز کے مقابلے میں دس روپے کے نوٹ کی کیا اہمیت تھی۔

کاغذ کا حقیر ٹکڑا۔ بوتل اپنے سامنے دیکھ کر اُس نے سوچا، اب میں بچ جاؤں گا اب اس دلدل میں نہیں دھنسوں گا۔ اور اُس نے بوتل کو زور سے گردن سے پکڑ لیا، شاید کہیں وہ اُس کا دامن چھڑا کر نہ بھاگ جائے، اس نے بیرے کو آواز دی۔

"جی سرکار۔"

"ایک مرغی بھون لو، دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو۔"

"بہت اچھا سرکار"

"اور ہاں دیکھو" اُس نے بیرے کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دے کر کہا "ایک ——— لے آؤ، دیکھو دبلی پتلی نہ ہو۔ تمھیں بھی انعام ملے گا۔"

بیرے کی باچھیں کھل گئیں، آنکھیں چمک اُٹھیں، گردن کی رگیں ایک قصاب کی طرح تن گئیں، اُس نے خوش ہو کر کہا "حضور بے فکر رہیں۔ ایسا عمدہ چوزہ لاؤں گا کہ......."

"جاؤ، جاؤ۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ اور بوتل کو گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔

ڈاک بنگلے کے باغ میں بنیے اور رُو نے باری باری بول رہے تھے۔ بنیے کہتے، بیں بیں بیں۔ رو نے کہتے ٹری ری ری۔ پھر دونوں چپ ہو جاتے اور یکایک کوئی نظر نہ آنے والا پرندہ کسی درخت پر اپنے پر پھڑپھڑانے لگتا۔ پھر رونے بول اُٹھتے ٹری ری ری۔ اور بنیے کہتے بیں، بیں، بیں، پی، پی، پی، او۔ وہ پیتا گیا، اور اُس کے دل کی اُداسی بڑھتی گئی، ڈاک بنگلے میں اس وقت کوئی

نہ تھا۔ اور اُس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گیرج میں جا کر اپنی موٹر سے لپٹ جائے، اور آنسو بہا بہا کر کہے "میں اکیلا ہوں، میری جان، میں اکیلا ہوں مجھے تم سے محبت ہے"۔۔۔۔۔۔ ٹری ری ری ۔۔۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔۔۔

جی ۔۔۔۔۔ پی ۔۔۔۔۔۔ پی ۔۔۔۔۔۔ پی، کیا وہ جئے یا پیئے ۔۔۔۔۔ بوتل خالی ہو گئی۔ اور وہ میز پر سر ٹیک کر جھک جانے کو تھا کہ یکایک کسی نے اُس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا۔ اور اُس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔

"تم کون ہو؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام زبیدہ ہے"۔ عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھا۔ اور کمرے کے اندر جانے کے لیے مڑا۔ بیرے نے اُسے سہارا دینا چاہا، لیکن اُس نے اُسے جھڑک کر کہا "ہٹ جاؤ میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا"۔ وہ اُس وقت اس جری سیاح کی طرح محسوس کر رہا تھا، جو کسی دُشوار گزار برفستان میں سفر کر رہا تھا۔ ایک سیاہی سی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، صرف کمرے میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا، روشنی، چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا مینار۔

۔۔۔۔۔ وہ اُس روشنی کی طرف بڑھتا چلا گیا، شاید وہ اب بھی بچ جائے گا یکایک اُس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اور وہ رُک گیا بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا، عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ......آؤ......" اس نے عورت کی طرف ہاتھ ہلا کر جھومتے ہوئے کہا "اِدھر اُدھر روشنی اِدھر ہے۔"

عورت ہولے ہولے قدموں سے قریب آگئی تھی۔ اُس کے بالوں میں عین درمیان سے ایک سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی، چاندی کے تار کی طرح۔ اور اُس نے دونوں طرف بالوں میں پر تکلف انداز میں ستھا لگایا ہوا تھا، ستھے کا موم بالوں پر لیمپ کی روشنی کے انعکاس سے بار بار چمک اٹھتا تھا، اُس کے کانوں میں چاندی کی ایک ایک بالی لٹک رہی تھی۔

اس نے عورت کے شانے پر جھک کر رازدارانہ لہجہ میں کہا:۔

"کیوں؟ تم اداس ہو......تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیدہ" اُس نے بے جان سے لہجہ میں کہا

"شبیدہ"......شبیدہ......اُس نے ہنس کر کہا "شبیدہ......ہوں......کیا خوب......" اس نے اُس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے......شبیدہ......پیاری ش......ش......شبیدہ......"

"یہ ستھا ہے۔ یہ موم اور جنگل کے جگین سے بنتا ہے۔ اس سے بال خوبصورت......"

"خوب شورت؟......خوب شورت شبیدآ......آ......آ......؟"
اُس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجہ میں کہا "تم بہت خوب شورت ہو

شبیدہ ......" اُس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور اُنگلی سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔" تم ...... تم ...... شبیدہ ہو ...... ؟
...... نہیں ...... تم میری ماں ہو ابھی ہی ہی"
اور وہ اس کے قریب گیا۔
عورت نے یکایک اس کے بازوؤں کو جھٹک دیا، جیسے اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔
"ہاں ...... ہاں ......" وہ چلا کر بولا" ش۔ ش۔ شبیدہ ماں ہے ...... شبیدہ میری بہن ہے ...... ش ش شبیدہ میں گنہگار ہوں شبیدہ تم یہاں کیوں آئیں ...... آج ...... ہیں ؟"
میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔
"غریب ؟ ہی ہی ہی"
" میرا بچہ بیمار ہے ؟ جرا، میرا ننھا سا جرا، ڈاگ دار (ڈاکٹر) نے کہا ہے۔ اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے، بیرے نے مجھے صرف تین روپے دئے ہیں، خدا کے لیے مجھے ایک روپیہ اور دیدو"
" نمونیا ؟ ہی ہی ہی ...... اُسے خ ...... خ ...... خیراتی ہسپتال لے جاؤ نا ...... نمونیا ...... ننھا جرا ......"
" یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے" عورت نے اداس لہجہ میں کہا" اور وہ بھی خیراتی ...... میرے اللہ ...... میں کیا کروں ...... میں تمھارے

پاؤں پڑتی ہوں...... خدا کے لیے مجھے ایک روپیہ اور دیدینا......
صرف ایک روپیہ"۔

"بس...... بس...... فکر نہ کرو...... ننھی شبیدہ۔" وہ اس کی گردن میں لپٹ کر کہنے لگا۔"میں تم پر مرتا ہوں، خوبصورت شبیدہ...... میں اکیلا ہوں...... میں اکیلا ہوں...... مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ۔ شبیدہ...... اس نے اس نے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ سویا پڑا تھا، عورت کے گلے میں اس کے بازو حمائل تھے۔ جیسے "وائٹ ہارس" کی بوتل پر اس کی انگلیاں، لیمپ کی مدھم روشنی جھلملا رہی تھی کالی رات کے سناٹے میں نظر نہ آنے والے بیے اور روتے ابھی تک بحث کئے جاتے تھے...... جی...... جی...... پی...... پی...... پی...... لیکن انھیں سننے والا وہاں موجود نہ تھا۔ کھائی اس کے سر پر ہموار ہو چکی تھی۔

جب وہ جاگا، تو خمار اتر چکا تھا، روشنی بجھ گئی تھی۔ سائے غائب ہو چکے تھے، بیے اور روتے خاموش تھے، صبح کا ہلکا سایہ تو چاروں طرف چھن رہا تھا، وہ ابھی تک اس کی آغوش میں مدہوش پڑی تھی۔ برہنہ، سلیقے سے آراستہ کئے ہوئے بال پریشان تھے اور سپید گردن کے ان حصوں پر سرخ سرخ نشان تھے جنھیں

وہ بار بار چومتا رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا سڈول، گداز، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ سے اُس کے پنڈے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی، جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں —— اُس کے رخساروں پر گری ہوئی پلکیں کانپیں۔ اس کے ہونٹوں سے ایک آہ سی نکلی۔ اور اُس نے آہستہ سے اُسی مدہوشی کے عالم میں کہا:۔"جرے ...... پیارے ننھے جرے ...." اور پھر اُس کے نیم وا لب اسی طرح آپس میں ملے، جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی ہو ...... ننھا جرا؟ ...... یکایک وہ چونک پڑا، گذری ہوئی رات کے موہوم سے سائے اُس کی آنکھوں کے آگے آتے گئے، ...... ننھا جرا .... نومونیا .... ڈاک دار ......

وہ کانپنے لگا ...... تین روپے ...... چار روپے ...... صرف ایک روپیہ اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن سے ہٹا لیے۔ ننھا جرا ...... اور اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ اپنی ماں سے زنا کر رہا ہو ...... اور وہ یک لخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا۔ جو اب جاگ گئی تھی، اور برہنہ تھی اور ساری رات اُس کی آغوش میں رہی تھی۔

وہ چیخ کر کہنے لگا "چھپا لو۔ چھپا لو۔ اپنے آپ کو اس کمبل میں ...... دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے ...... کیوں اس طرح پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو ...... سنتی نہیں ہو کیا؟ ...... میں کہتا ہوں،

اُٹھو، اُٹھو.......میرے بستر سے.......یہ لو.......یہ لو.......ایک روپیہ دو روپے، تین روپے، چار روپے، یہ سب لے لو، بھاگو یہاں سے! بھاگو!! بھاگو!!!"

اور اُس نے اس عورت کو کمبل اڑھا کر اُس کے کپڑے اُس کے ہاتھ میں دے کر اُسے کمرے سے باہر نکال دیا۔

بہت دیر تک وہ بستر پہ سر پکڑے بیٹھا رہا، دل و دماغ پر ایک مبہم سی الجھن ایک مکڑی کے جالے کی طرح تنی ہوئی تھی۔ جو اُسے بار بار پریشان کر رہی تھی، اور وہ کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے اُلجھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس مکڑی کے جالے کو دُور کرنے کی کوشش کرتا رہا آخر جب بیرے نے آکر اُس سے کہا، "صاحب غسل خانہ میں گرم پانی دھرا ہے۔ تو وہ بے دلی سے اُٹھا اور پوٹاشیم پرمینگنیٹ کی پچکاری اٹھا کر غسلخانے میں گھس گیا۔ طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی، اور منھ کا کڑوا کسیلا ذائقہ ہوش آنے پر بھی دُور نہ ہوا تھا شانے بوجھل سے تھے۔ نہا کر وہ برآمدے میں میز پر کہنیاں ٹیک کر ناشتے کا انتظار کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کر دی۔ بیئر کے خوش رنگ سیال نے آہستہ آہستہ اُس کے خیالات کی رو کو بدل دیا۔ اس کی طبیعت مفرح ہوتی گئی، وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا، اور سیٹیاں بجانے لگا، بیتی ہوئی راتوں کے لمحے خوش گوار اور دلکش بنتے چلے گئے، ستھرے سے چکتے ہوئے بال،.... سیاہ قمیص پر

چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم ...... تہالو کا غیر فانی حسن، بلبل کا نغمہ، پپیہے کی پی پی، اور سیب کے پھول چاندنی میں ہنستے ہوئے، یکایک کسی راستے میں چمکتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اچھلنے اور اُبل اُبل کر قہقہہ لگانے لگا، اور اُسے اپنی کار کی یاد آئی جو گیرج میں پڑی اس کی راہ تک رہی تھی۔ اور وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے بیرے کو انعام دے کر پوچھا "گرمھی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کئے میل دُور ہو گا"

"ایک سو دس میل سرکار"

"ہاں، بیرے کا کیا نام ہے؟"

"خادم شاہ، حضور"

"ہُم"

"بہت اچھا آدمی ہے" بیرے نے کہا "صاحب لوگوں کا پرانا خادم ہے حضور ......"

ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اُسے ایک نیلے رنگ کی کار مل گئی جو ڈاک بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور دُہری ٹھوڑی والا آدمی، جس نے سیاہ پھندنے والی رومی ٹوپی پہن رکھی تھی، کار چلا رہا تھا، اس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی، نیلی سوسی کی شلوار سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم اور آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے جان اداسی اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز .... غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پر بلند کوٹ بنائے تھے۔ لیکن

حقیقت یہ تھی کہ اُن کے میکے اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اُس نے دِل ہی دل میں خداوند لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اُس کے لیے دلکش راتیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، وائٹ ہارس، اور بھنا ہوا مُرغ ...... الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تو نے بنائی ہیں۔۔ ...... اس کے تخیل میں گڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا اور اُس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔

موٹر کے آگے اور پیچھے، چیڑھ اور دیودار کے گھنے اور سبز جنگلوں کے درمیان چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی وہ پکی سڑک پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک، ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک، ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک، یہ وہی نقرئی تار ہے جس نے انسانوں کے دل تاریک کر دیئے ہیں۔ عورتوں کی عصمتیں ویران کر ڈالی ہیں۔ اور سماج کی روح کو آتشک کے جہنم میں جھلسا دیا ہے!

محمد حسن عسکری

چائے کی پیالی

محمد حسن عسکری نے صرف آٹھ دس افسانے لکھ کر اردو ادب میں اتنا ممتاز مقام کیسے حاصل کر لیا؟" —— یہ سوال اکثر وہ نوجوان کرتے ہیں جو انگریزی فن تنقید کی دو چار کتابیں پڑھ لینے کے بعد ہر ادیب کا ذہنی اپریشن کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اور بہترین سے بہترین افسانے کے متعلق اُن کی رائے ہمیشہ یہی ہوتی ہے "بھئی چیخوف اور —— اور گورکی اور ہر چیز اور —— " لیکن عسکری نے اس تھوڑے عرصے میں اپنے آپ کو اس غیر فانی شہرت کا حقدار ثابت کیا ہے۔ جزئیات نگاری اشاریت اور منظم جذبات کا جو حسین امتزاج ہمیں عسکری کے ہاں دکھائی دیتا ہے وہ اردو ادب کے لیے سرمایۂ نشاط اور نوید بہار ہے چائے کی پیالی میں ایک خاموشی ہے، سکون ہے۔ خمار ہے۔ لیکن اس خاموشی۔ سکون اور خمار کے نیچے زندگی کی ابدی تڑپ اور ان سے نکلتے ہوئے ہلکے ہلکے دھوئیں کا وجود فن کی وہ بلندی ہے جہاں تک صرف عسکری پہنچ سکتا ہے کھوئی کھوئی مس ڈولی جب اپنے آپ کو ماضی کے دھندلکوں کے حوالے کر دیتی ہے تو محض ایک کہانی کا کردار بن کر نہیں رہ جاتی۔ بلکہ لاری کے ساتھ ساتھ ہم اس کے ذہنی ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ اور جب اس کے مستقبل کے محل کے حال کی بے کیفیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ تو ہمیں ڈولی پر رحم آتا ہے، اور ہماری نظریں ظالم فن کار کو ڈھونڈھتی ہیں، جو ہمیں گہرے سوچ اور تفکر کی بھول بھلیاں میں چھوڑ کر شاید اُسی لاری پر کسی نئی ڈولی کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔

حالانکہ وہ یہ دیکھنا تو چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کون سی نئی دکانیں کھلی ہیں، کون کون سے پرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں، وہ گورا گورا سُنار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں، سنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا، بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انھیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے! وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی۔ اور خود کو بڑا ہلکا اور سبک محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی بڑی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، اور سیٹ پر خوب کھل کر بیٹھ گئی۔ بے شمار دوڑتی ہوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں —— ہیچ مقدار اور ناچیز، بلکہ مضحکہ خیز لکیریں —— اور وہ بلندی پر بیٹھی ان کی سراسیمگی سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گن گن کر قدم رکھتا، اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دکاندار اُسے دیکھ کر چونک سے پڑتے، اُن کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتیں، اور وہ سوچتے "اوہ، اب یہ کتنی شاندار ہو گئی ہے!

اُس کے بال کیسے چمکیلے ہیں، اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!" مگر اُن کے دل میں تجسس اور تحیر کبھی نہ پیدا ہوتا، اور نہ اُن کی آنکھوں کی چمک یہ پوچھتی۔"کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے۔" اس کے خلاف اُن کا انداز تو کچھ سرپرستانہ ہوتا، اور اُن کے خیالات کچھ اِس قسم کے ہوتے "بھئی، ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ نکالا ہے! شاباش شاباش! جیسے اُس کے رنگ روپ نکالنے میں اُن کی کوششوں کو بھی دخل ہو؛ اور وہ اُس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پُرتجمل چیز کے حصول پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ اُن کی ہلکی زیرلب مُسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں: "کہو اچھی تو رہیں، بہت دن میں دکھائی دی ہو۔" یا پھر جیسے انھیں یہ توقع ہو کہ وہ اُن کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پروانہ کرتے کہ وہ اب یہاں کے.... "مشن گرلس اسکول" میں نہیں پڑھتی جس پر دھندلے اردو حرفوں میں "لڑکیوں کا مدرسہ" لکھا رہتا ہے، بلکہ ایلی نگر کے "کرسچین گرلس انسٹی ٹیوٹ" کی طالبِ علم ہے۔ اور نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اُسے ہلائے ڈال رہے ہیں وہ تو بس زمین پر پڑے گستاخانہ کہتے رہتے: "ارے اب تم سے کیا وہ۔ تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو، نہ جانے کتنی بار تمہارے ٹھوکریں لگی ہیں۔ اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آگئی تھی" بس بالکل اس بسکٹ بنانے والے کی طرح جو اُسے دیکھ کر اپنے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا: "اوہ، یہ تو وہی ہے عیسائی کی ——" اور دکانوں کے چھجوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اُسے گھیر لیتے، کھسکتے، رینگتے

گھسٹتے اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے، اُس کے قدموں سے لپٹے جاتے، اُس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے، بے کسی کے لہجے میں، بھنچے ہوئے گلے سے کہتے، جیسے جان توڑ رہے ہوں "بس ایک لمحہ ٹھیر جاؤ .... بس ایک نظر .... اپنے پرانے سایوں کی طرف"۔ اور اُن کی یہ عاجزی اور منت سماجت بے کار نہ جاتی۔ اُس کے ڈھیلا پڑتے ہی وہ اُس کے دل میں گھس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کر سو جاتے، یہاں تک کہ اُس کا سر ڈھلک جاتا۔ سانس ہلکا مگر بھاری پتھر ہو جاتا، اور اُس پر کسل مندی طاری ہو جاتی۔ جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی۔ لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت نے اُسے ان تمام پیچی ہوئی، چپچپاتی الجھنوں اور جھنجھٹوں سے بچا لیا تھا۔ وہ اب کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی، اُس کی شخصیت گھل کر دوسری چیزوں میں نہیں مل جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی، صرف اور محض ــــــ مس ڈولی روبنسن ــــــ بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک، گلابی دوپٹہ، اور اونچی ایڑی کا کالا جوتا پہنے ہوئے سفید چکنی پنڈلیاں تانگے پر مضبوطی سے جمی ہوئیں، کہنی تکیئے پر، سنہرے بندے دونوں طرف جھول جھول کر چمتے ہوئے، احتیاط سے بنے ہوئے کالے بال، اور پاؤڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اُسے "ڈولی!" کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر مار کر کہتی "کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی؟ مگر معاف کیجیے گا، میں تو مس روبنسن ہوں، کرسچین گرلس انسٹی ٹیوٹ اپلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم اور میں موجود تو ہوں آپ کے سامنے دیکھ لیجیے بھلا میں ڈولی ہو سکتی ہوں؟" اگر وہ محض مس روبنسن بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ، کوئی سیڑھی، کوئی دہلیز کوئی گڑھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کیے چلا جاتا۔

مگر تھمو تو۔ ہم تو تمھیں مدتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں۔" شہر کے باہر باہر
جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خود دار پرتمکنت
اور بے نیاز واقع ہوئی تھیں، وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اس پر بڑی
مہربان ہوئیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں۔" اچھا، تو آپ کا نام مس روبنسن ہے!
جی! بہت خوب۔" ان کوٹھیوں کے مطالبوں سے تو وہ یوں آزاد ہو گئی، مگر دوپہر
کا سورج تو عملی طور سے اس کی مدد کر رہا تھا۔ ایک سخت گیر آقا کی طرح اس نے
اپنی نگاہ گرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا تھا، اور وہ ہم
ہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی
تھی کہ ان کا رنگ ونگ سب اڑ گیا تھا، اور ان کے دل سے خود نمائی کے
دعوے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جلی بھنی کھڑی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں۔" چاہے
دیکھو چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ۔" جہنم میں جاؤ! ان کی چڑچڑاہٹ اور
کوسنے بھی کتنے مضحکہ خیز تھے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے! تانگے کے تختے پر اس کے
پیر کا دباؤ اسے برابر یاد دلائے جا رہا تھا کہ اُسے ان گرد و پیش کی چیزوں پر حاوی
ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ مس روبنسن
ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں اور آستینوں سے باہر نکلے ہوئے، اور پھر یہ
بھی کچھ کم نہیں کہ وہ ایلی نگر سے آ رہی ہے جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہوئی کوٹھیاں
ہیں، شاندار اسٹیشن اور فرحتناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ
رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اس کے لیے جاذب نظر ہیں۔ اب
کیا وہ آنکھیں بند کر لے؟ اگر وہ رشک، وحسد سے پھنکی جا رہی ہو تو خیر کر بھی لے۔

اب تک تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی لائی تھی، مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اُسے اپنی مجبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں اناج کی گاڑیوں، اِکّوں، گھاس والیوں، مونچھوں والے کسانوں، گڑ کی جلیبیوں پر بھنکتے ہوئے پتنگوں اور لوہے کی دکانوں کی دوسرے شور وغل سے اوپر سنائی دینے والی ٹھناٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی عجیب یا مضحکہ خیز نہیں ——— محض مہمل اور ناقابل توجہ جیسے مسٹر تربوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی ——— یا زیادہ سے زیادہ ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے ایک اِکّے میں دو مرد، چار عورتیں، پانچ بچے یا گاڑی میں لگا ہوا ایک پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز ہر چیز کی حیثیت معین تھی، واضح، واشح، روشن، قطعی، پوری طرح اپنی لکیروں کے درمیان ——— نہ کہیں سے رنگ بہا ہوا، نہ کہیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی فردیت تھی ——— علٰحدہ، ٹھوس، مستقل، جری، اپنی جگہ پر مطمئن، مرنجان مرنج۔ نہ تو وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ دبا لینا چاہتی تھیں، اور نہ گڑگڑا کر التجائیں کرتی تھیں کہ انھیں کوئی اپنے اندر مدغم کرلے۔ بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا، اور اُسے اوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور پھر ان سب نے ایک دوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتا کرلیا تھا، اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوششیں ہو رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی ——— ایلی نگر کی مس روبنسن بھی

مس روبنسن کے لیے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آکر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بے زار نہیں تھی۔ اُس پر تو بس ایک مطمئن تعطّل کی کیفیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور اڈّے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت روح افزا نہ تھا؛ اپنا ہی ایک آدھ پانی اور سوڈا واٹر کی دکان تھی، یا پھر درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے، ایک دوسرے سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ مگر پھر بھی اُسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا حسیاتی جمود ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کم سے کم اپنا ردِ عمل تو معین کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اسی طرح دبا رہا تھا، "تکیہ پھر اُس کی کہنی کے نیچے واپس آگیا تھا، اور خود تانگہ بھی پہلے سے اونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ سامنے والی دکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ اس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ یہ نائی کے لڑکے جو اُسے کن آنکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے، اُس کی آنکھوں اور رخساروں کو پھڑکا سکتے ہیں، اُس کے ہونٹوں کو مائل تبسم کر سکتے ہیں، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے —— اتنا بھی نہیں جتنا سینما کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹریس کا، کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دے کر کم سے کم ایکٹریس کے گالوں کے گڑھوں پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں مگر مس روبنسن اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں اُن کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ گھڑگھڑاتے اِکوں، لاریوں کی قطاروں، موٹر کے ہارن کی آوازوں، اِکّے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ اپنی نگر کی مجلّا و مصفّا اور پُر سکون فضائیں رہنے کے بعد یہ شور و غوغا، یہ ہنگامہ رُستا خیز اور یہ گرد کے بادل اُسے ناگوار گزر رہے ہوں، اور اُس نے دو ایک بار "فُوہ! ...... فُوہ!" کرنے کے بعد مُنھ پر رومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں، اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری جگھیڑے جاتی ہے، اور لال رنگ کی ٹیکم پور، اور وہ ٹوٹی ہوئی چھتری والا اِکّہ بہت سُست چلتا ہے، اور وہ داڑھی والا آدمی چنگی کا منشی ہے کوئی بھی چیز پُر عناد نہ تھی، بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و پیش کی ساری چیزیں بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر، نہ جانے کیوں، وہ مس روبنسن کی شخصیت کو پھیلا کر اِس ماحول پر مسلّط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اور نہ اُس سے یہ ہوتا تھا کہ دُولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹتی تھی، سکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی جیسے کوئی وار روک رہی ہو کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی چلا جائے، اور کبھی یہ کہ بہت سے اِکّے سامنے ہو جائیں، اور تانگہ رُکا کھڑا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اُس کی حالت بس بالکل اُس نوخیز لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی

نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپاتی پھرے، اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو گھنٹوں ہونٹ کاٹتی رہے وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اُس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی، اور اُس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی، کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اُسی کی تو اُسے ذرا ذرا سی تفصیل یاد تھی۔ جب اُس کی اپنی لاری کے بجائے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اُسے خوشی ہوتی تھی کہ چلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اُس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آکر کہا "کہاں جانا ہے؟ ٹیکم پور؟" تو اُسے ایک گونہ تکلیف ہوتی — اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اُسے پہچانتا نہ ہو۔

اُس نے بڑی گلو گرفتہ آواز سے جواب دیا "ہاں ...... نہیں۔ سعد آباد"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں" ایجنٹ نے ایک اِکّے کی طرف جاتے ہوئے کہا "وہ بھورے رنگ کی ...... بس تیار ہے"

تانگہ رکنے سے پہلے ہی اُس نے تانگے والے کو پیسے پکڑا دیئے اور جلدی سے نیچے کود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیرنگ وہیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈوبی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا۔ مگر ہونٹوں تک آتے آتے اُس کے لفظ بدل گئے۔ اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا جیسے اُسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویہ ایسا ملتفت آمیز نہ تھا، مگر اس کی آواز سنتے ہی ڈوبی کو

ایسا معلوم ہوا جیسے سرد سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان یکایک ایک کمرے نے آکر اُسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اُس کے لیے اسم اعظم کی وہ تختی بن گیا تھا جو اُسے ہر قسم کے آسیبوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟..... یہی کوئی ڈھائی تین بجے۔"

"تو کے بجے؟..... ٹھیک؟"

"ہاں..... بس تین بجے چل پڑے گی لاری۔"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں مذبذب تھی۔ دو ایک لمحے نیچے دیکھنے کے بعد اُس نے پوچھا۔ "اور اب کیا بجا ہوگا؟"

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا۔ "کوئی ایک ہوگا۔"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا، مگر ڈولی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو ——"

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اُس کی مردانگی غالب ہو چکی تھی، اور اُسے یہ بھی خیال آگیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دعا ہے ہی۔ اس لیے وہ اُٹھ بیٹھا، اور کلینر کو دو تین آوازیں دے کر ڈولی کا سامان اوپر رکھ دینے کے لیے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد ہی مطمئن ہو گئی، مگر جگہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا وہ باہر ہی سے کھڑی کھڑی اندر کا جائزہ لے رہی تھی پیچھے کی طرف ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پاجامہ پہنے، پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی، اور اپنے پوپلے منہ سے پان چبا رہی تھی

اُس کے سامنے کی سیٹ پر ایک آدمی جو اس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، بیٹھا ایک گھٹھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچ کے حصّے میں رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب نکر پہنے ہوئے، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی تھا جو گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اُس کے پاس رکھے تھے اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈوبی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے، اور اِدھر اُدھر دھوپ اب ناقابل برداشت ہوئی جارہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے والی ہی تھی کہ ڈرائیور نے سر اُٹھا کر کہا۔ "بیٹھو، اندر بیٹھو۔ بس اب چلنے ہے لاری۔"

گو "بیٹھو" ذرا چونکا دینے والی بات تھی، مگر اُس کی آواز سن کر ڈوبی کے دل میں یہ امید پیدا ہوگئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اُس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے اُس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "ہاں...... اچھا ...... کہاں بیٹھو؟"

"یہاں آجاؤ، بیچ کی سیٹ پہ" ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

"ہاں...... لیکن" ڈوبی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی "اگر آگے ——"

"آگے؟...... آگے تو جی، آج درو غاجی جارہے ہیں۔ آگے تو اُن کی جگہ ہے"

مگر جب ڈوبی اُسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی، اور کھانستا ہوا نیچے اتر آیا۔ "آگے بیٹھو ہو" اس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ ہمیں کیا ہمارے لئے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن درو غاجی جا رہے ہیں۔ ہیں آج۔"

ڈولی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے بچاؤ کے لیے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تُلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اُسے تکلیف دینے سے روک سکے، مگر وہ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں، اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس ٹھیک کرنے لگی۔ کئی منٹ تک رومال سے ہوا کرنے کے بعد اُسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اس نے یکایک یہ دیکھا کہ لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں جن میں اُس کا چہرہ نظر آ رہا ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری نگاہ نے حیرت کو کسماہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اُس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے۔ اور ارد گرد سے بھورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اُس کے چہرے کو تمتا دیا تھا اور وہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خشک پیڑیوں نے اُس کے ہونٹوں کی سرخی زائل کر دی تھی، اور اُس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھیں۔ اُس نے شرما کر گھبراتے ہوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا، زور زور سے چہرے کو رگڑا، اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھل بھی گئے۔ آخر اُس نے جھنجلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجّن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ تاروں والی ہری ساڑھی، لمبے لمبے بُندے۔ پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی، سُرخ چہرہ، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لیے اُس کی نگاہیں آگے بڑھ گئیں، اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی

قطار کی قطار کھڑی تھی، مگر اُسے صرف اُن کے انجن اور مدگارڈ نظر آرہے تھے۔ سامنے دو اِکّے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، اور اپنے اپنے اِکّوں کی طرف کھینچ رہے تھے دو ایک خوانچے والے، پانی پلانے والا اور چند کلینر جمع ہو گئے تھے اور آدھے ایک اِکّے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا سا بیٹھا تھا۔ وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمت کر رہا تھا، اور اس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک اونچا سا ڈھیر تھا جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا، خشک اور بالکل سفید، دھوپ کی سختی کے باوجود مطمئن اور ساکن ـــــ بے نیاز، جیسے کوئی معمر اور جہاں دیدہ روایتی فلسفی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اٹھتا تھا، اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے ہوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دور آگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچی دیواریں اور چھپر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچہ درختوں سے باہر نکل آتا تھا، اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادے کی شکل میں تبدیل ہو کر تفکرانہ انداز میں اُس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے

ہوا سے اڑتی ہوئی چادر کی طرح اوپر اٹھے ہوئے ایں اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا۔
جیسے اُس کی روح اپنے جسم کو وہیں چھایا ہوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو اور ایک ننھی سی
ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی بہار کی
شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چٹ چٹاتی پھر رہی ہو۔
ٹانگیں ہلا کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر، سر کو کچھ تو اضمحلال اور کچھ جذبہ تسلیم و
رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہوئے، وہ بگولوں کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی
گئی تھی۔ جو اُسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اُتر جاتے تھے، اور وہاں سے آسمان کی
متخیل نیلاہٹیں اُسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک آم کے
پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی، اس نے آم کے
پتوں کی تر و تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی، فضا کی طراوت اور خواب نما کی
اُس کے جسم میں اتر گئی تھی اور وہ کچی دیوار اُسے اپنی پرانی ہمجولی معلوم ہونے لگی تھی

اسی لیے جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا
تو اُس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مڑیں۔ ایک اِکّے میں سے
دو تین عورتیں، بچے اور کچھ مرد اترے تھے، اور اُن کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا
ڈولی کو پیچھے پھر کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں پچھلے حصّے میں چند آدمی
اور بیٹھ چکے تھے۔ اُن کے قریب ہی نیچے چاٹ والا اپنا خوانچہ لیے بیٹھا تھا جسے
دیکھتے ہی بچوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا تھا، اور اپنی ماؤں کو اوپر چڑھنے کی
بھی اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لیے
پٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں، اور اُن کے کلینر زور زور سے آوازیں

لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں لے لیں۔ لاریوں کے چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور اُن کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے یکایک ڈوؤی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پٹرول کی دکان کے قریب بن رہا تھا۔ اور جس کی طرف اُس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہاں خالی زمین پڑی تھی، جہاں کُتے اپنی کھلاڑیوں سے گرد اُڑاتے رہتے تھے، اور کبھی کبھار کوئی خوانچے والا ستانے کے لیے آ بیٹھتا تھا۔ لیکن اب تو وہاں باڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا، بس چھت پوری ہونے کی کسر تھی مکان کے اندر اندھیرا سا تھا، اور اُس کی زمین ابھی سیلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی، پر کیف اور ذہن کو کند کر دینے والی خنکی تھی جو ڈوؤی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائی جا رہی تھی۔ اُس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو سُست کئے دے رہی تھی۔ داہنی طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو اُس کا چھوٹا بھائی فریڈی اس کا بستر کرے گا، اُس کا ٹرنک کھولنے کو بے تاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ بُوا اس کے واسطے کیا لائی ہیں، اور جب وہ کچھ نہ پائے گا تو بہت مایوس ہو گا اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے آٹھ آنے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد بھی اُس کے پاس چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنس کو خط لکھنے کے لیے بھی ہو تو بھی تین آنے میں کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اُتر کر پھل والے کے پاس گئی، اور ایک منٹ تک اُس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا "سنترے کیا حساب دئے ہیں"؟

اُمیدوں سے بھرے ہوئے پھل والے نے کہا "پانچ پانچ پیسے کے لگے ہیں"

میم صاحب۔"

"پانچ پیسے کا ایک ؟"

"ہاں، پانچ پانچ پیسے بڑے میٹھے ہیں، میم صاحب۔ تو چکھ کے دیکھو۔"

نہیں، نہیں، رہنے دو" اُس نے تین آنے کو پانچ پیسے سے تقسیم کرتے ہوئے کہا "تین تین پیسے نہیں ؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں، میم صاحب" پھل والے نے اپنی باطل امیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا۔ "تو کیلے لو۔ پانچ پیسے کے دو دیے ہیں۔"

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اُس نے آدھی مایوس ہو کر پوچھا۔ "کچھ کم نہیں کرو گے ؟"

"کم ؟" اجی تمھیں نہیں لینا دینا، لاد کیلا، میں چلوں"۔ اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا۔ "لو، چودھری، چوس لو۔ رسیلے ہو رہے ہیں رسیلے۔"

یکا یک اُس کے حلق میں ڈاٹ سی اڑ گئی، اور سانس لینے کی کوشش میں کن پٹیوں کی رگیں اُبھر آئیں۔ اس کے شانے خود بخود کام کرنے والے مدافعتی آلات کی طرح نیچے جھک گئے۔ اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ کھڑی تھی۔ دفعتہً بلند ہو گئی ہے اور ساری دنیا کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئی ہیں۔ اُس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے، اور اُس نے تین آنے پھینکتے ہوئے کہا "بسکٹ"

"بکٹ ہ؟" یہ محض ایک لفظ بکٹ والے کے لیے کسی قدر مبہم تھا

اس نے پوچھا۔ "ایک آنے درجن والے کہ تین پیسے درجن والے۔؟"

"کوئی سے" ڈوبی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اُس نے بغیر کچھ کہے سُنے تین بنڈل ہاتھ میں پکڑ لیے، اور تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اپنی جگہ پر واپس چلی آئی۔ مگر بیٹھنے کے بعد تو اُس کا دل اُس تیزی سے دھڑدھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگنے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ دل تھوڑا سا نیچے کھسکتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اُس کی چھاتیاں بڑی بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں، اور ان میں کوئی چیز ابل رہی تھی، سنسنا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا جسے خشک کرنے کی کوشش میں اُس کا سانس بھاری اور دشوار بن کر اُس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کیے دے رہا تھا۔ وہ جتنی نیچی ہو سکتی تھی ہو گئی، اور دوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ دوپٹے کے لمس میں تسکین تھی، دلاسا تھا، ہمدردی اور غم گساری تھی، شفقت اور محبت، اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور محافظت کرنے کا وعدہ! اس کی کھال سے دوپٹہ کیا چھوا تھا آگ پر پانی پڑا تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا، اور چند ہی منٹ میں اُس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے بخار کے بعد۔

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جماہیاں لینے سے بھی اُس کی تسکین نہ ہوتی، اس کا جی چاہ رہا تھا

کہ لمبی سی انگڑائی لے، یا ٹانگوں کو خوب تان کر پھیلا دے ——— لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا اُس کی ٹانگوں کے مان کا نہ تھا۔ اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ تھا کہ اس کا دوپٹہ پھسل جاتا۔ اور بازو اوپر اُٹھتے جہاں سب کی نظریں اُن پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اُس نے ڈرائیور کو پکار کر بلایا، اور وقت پوچھا

"اب چلے ہے" ڈرائیور نے کہا۔ گھبراؤ کیوں ہو"

"مگر ویسے بجا کیا ہے؟"

"سوا دو بج رہے ہیں اب"

ابھی پورا پون گھنٹہ باقی تھا۔ اور یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی رانیں پتھر ہوئی جا رہی تھیں پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی، مگر اُسے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ لاری والوں کے وعدے کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اُس نے کسی المیہ کی ہیروئن کی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا، اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی اور پھر اندر جائے گی۔ فریڈی اُسے دیکھتے ہی "ڈولی بوا، ڈولی بوا" چیختا دوڑے گا، اور آ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا۔ ڈولی بوا۔ کیا لائی ہو؟ دکھاؤ ...... انگریزی مٹھائی لائی ہو؟ ...... تم کہہ گئی تھیں! جب اُسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد بھی کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھن ٹھنانے لگے گا۔ وہ اُسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی۔ ہے نا! یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ

چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی "اچھا آنکھیں بند کرو، دیکھو ہم تمھیں ایک چیز دیں"۔ فریڈی یقین نہیں کرے گا اور بڑی دیر کی بحث کے بعد آنکھیں بند کرے گا۔ اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا بنڈل دے دے گی۔ جسے دیکھ کر فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا، اور وہ اُسے گود میں اُٹھا کر خوب پیار کرے گی ـــــ جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اُس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی اور کہے گی "ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے" فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اُس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ اُس کے جسم میں رس اترتا چلا جائے گا، اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اس کے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا، مگر وہ اُسے صاف نہیں کرے گی بلکہ یوں ہی رہنے دے گی۔ ـــــ اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتے تو چلیں گے گو اُس نے جلدی میں پورے تین آنے پھینک دئے تھے مگر خیر ٹھیک ہے ـــــ اب وہ برنس کو لفافے کے بجائے کارڈ بھیج دے گی۔ چلتے ہوئے برنس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا۔ چونکہ وہ وعدہ کر آئی ہے، اس لیے چٹھیوں بھر اُسے بھیجتی رہے گی ـــــ لفافہ نہ سہی تو کارڈ تو ضرور . . . . . مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا جائے گا؟ . . . . . بہرحال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا ـــــ پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشن کے اشتہاروں کی ردی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سنا کر اناج لایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ اُن کے اناج لے لیا

کرے گی، اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیج کر اُس کے
پیسے منگوا لیا کرے گی۔۔۔۔۔ وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور
خط بھیجے گی۔۔۔۔۔ کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک ایک چارپائی
پر بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اُن کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے
ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں
باہیں ڈالے ہوئے تھیں، اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات اُن کے سینے
مل جاتے تھے۔ ان کے تھوک نگلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونجتی تھی دونوں کے
بازو جل رہے تھے، مگر اُن کا مس کتنا راحت بخش تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ
یہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں، مگر بغیر کسی خاص سبب کے اُسے کچھ ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں
اور پھر اس راحت کے احساس کی شدت بھی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت
تھی۔ اس لیے اُسے بار بار باہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔ اس رخصت کی رات
برنس نے اپنے سارے راز جنھیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی، ایک ایک کر کے
بتا دئے تھے۔ اس نے سنایا تھا کہ ایک دن جب سارا اسکول مل کر سینما گیا
تھا تو ایک لڑکا جو اُس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ برابر اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ برنس
نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا، اور اندھیرے میں اُس نے
ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں
سب سے زیادہ دلچسپ اُس لڑکے کا قصہ تھا جو اُسے چھٹیوں میں ملا تھا۔
وہ جب اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصہ سنانے سے پہلے اُس نے رکتی ہوئی آواز

میں کہا تھا" ذرا اور قریب کھسک آؤ"۔ برنس نے اپنا بازو مضبوطی سے اس کے
گرد ڈال لیا تھا اور اُس کی کمر تھپ تھپائی جاتی تھی۔ اس کا دل بڑے زور سے
دھڑک رہا تھا، اور جسم سے لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اُس نے دیوی
داس بتایا تھا جو اُس کے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا، اور بڑا گورا اور خوبصورت
تھا، اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا۔ دیوی داس کی خوش مزاجی نے اُس کی
مدافعت پر جلد قابو پا لیا تھا۔ جب اس کا بھائی اِدھر اُدھر ہوتا تو وہ اُسے
گود میں بٹھا لیتا تھا، اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا۔" اور وہ" برنس نے
اپنی ٹھوڑی سے سینے کی طرف اشارہ کر کے لفظ چباتے ہوئے کہا تھا" یہاں
ہاتھ رکھے رہتا تھا۔ قصہ سُناتے سُناتے برنس نے رک کر تکیے سے سر اٹھا لیا
تھا، اور چند لمحے اُس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد
ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا" ڈولی، ہم پیار کریں تمھیں؟" اور اس کی خاموشی کو
رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے
کے لیے اُس کے گالوں پر رکھ دئے تھے۔ اس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا
اطمینان، بے فکری اور محفوظ ہونے کا احساس ہوا تھا جیسے چھوٹے سے
کنگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر ـــــــ قصے کے دوران میں اُس نے
اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں
سے دور ہیں، مگر اُس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا گیا تھا
ـــــــ اُس کے روکنے کے باوجود ـــــــ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے
بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں، اور بار بار چادروں سے ہاتھ اور مُنھ

نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں ــــــ چلنے سے پہلے وہ
دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر اُن میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو
ایسی کھنچن محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے بدن جُڑے ہوئے ہوں۔۔۔۔ برنس
کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی ــــ
ــــ برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اُداس رہی تھی، خصوصاً
ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی۔ کھیت جھاڑیاں، تار کے
کھمبے، درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم کر افق کی طرف نکلے چلے
جاتے تھے، گویا وہ اُسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انھیں دیکھتے
دیکھتے اُس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کے
سینے کے بیچوں بیچ کوئی چیز ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی تھی جو اندر اترتی چلی جاتی تھی۔
اس کا جی چاہا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے، اور نزع میں پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے
کی طرح اپنا سینہ دیوار کے تختے سے لگا دے، اور ساری دنیا سے غافل ہو
جائے ــــ جب وہ لال لال پل آیا تھا تو اُسے ذرا ڈھارس بندھی تھی
کہ اس نظارے سے اس کی افسردگی دور ہو جائے گی مگر ان دیووں کی
سی سرخ ٹانگوں سے جو اُسے دریا کے نیلے نیلے، چمکتے ہوئے پانیوں کو اچھی طرح
دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ گھڑ گھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوئی تھی کہ اگر پل
جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ مارے وحشت کے رو دیتی۔۔۔۔ اُسے کچھ پتہ نہیں رہا
تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی جولیا کی میٹھی ہوئی آواز، یا گریس کی چیخیں
جیسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں، یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے

کے لیے اس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا ...... برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ لی ہو گی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہو گی۔ جو اس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے ...... برنس دھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اتری ہو گی، اور اس کے ہرے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بولی ہوں گی ...... اس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اتارنے کے لیے کہا ہو گا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی ......

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے بھڑ سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی لیکن ہمیں سر اور ہاتھ ہلانے جلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لیے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں "لو بھئی، چلی تو کسی طرح!"

"کچھ معلوم بھی ہے؟" ڈرائیور نے کلینر کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا۔ "پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں۔"

لاری کا انجن بھر بھرانے لگا۔ ننھے ننھے چکر اس کے پیروں میں داخل ہوئے، اور گول گھومتے، ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے، اوپر چڑھتے چلے گئے، اور پنڈلیوں، رانوں، پیٹ، چھاتیوں، بغلوں، بازوؤں، کانوں اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیئے تاکہ اس کے پیر اور جھن جھنانے لگیں، مگر ایک دفعہ چکروں کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پیل میں آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ پیٹ کے نچلے حصے میں اٹک کر ادھر ادھر

مچانے لگا یہاں تک کہ ڈوبی نے بجلی کی سی سرعت سے پیر کھینچ لیے اور اپنے
دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لیے۔ لاری اُسے ہلکے ہلکے جھکولے دیتی آگے بڑھی، مگر
وہ ابھی رینگ رینگ کر ہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رُک گئی
"کیوں بھیّا" کسی نے پچھلے حصّے سے پکارا "کیا اور بٹھا دے ہے؟
یہاں پہلے ہی گھٹے جا رہے ہیں مرے یاں"
مگر ڈرائیور نے اُسے ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا، اور اتر کر
پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لیے کہا......پمپ کے اُجلے
صاف شیشے میں نقرئی سیال اٹھلا اٹھلا کر اور ٹھمک ٹھمک کر اوپر چڑھنے لگا۔
سب سے زیادہ جو چیز ڈوبی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے تھے جو ابلتے
ہوئے شفاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے پٹرول کی بُو کے
باوجود اس نے سر نہیں پھیرا تھا اور تیل کو چڑھتے اترتے دیکھتی رہی تھی جس سے
اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی، اور اُس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ سی
ہونے لگی تھی جو اُسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اِکّوں کو گرد کے بادلوں میں چھپاتی پھر روانہ ہوئی۔
ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا جیسے ہی اُس کا ہاتھ کلچ پر پہنچتا تھا ڈوبی
سانس کو حلق ہی میں روک کر، کسی گمنام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو۔ جو
اس وقت انتظار، ارتعاش، کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک
کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا، ہوا پر جس کی ہستی اُسے ٹھوس اور مرئی معلوم
ہو رہی تھی، آگے جھکا دیتی تھی ...... ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے

کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔ اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اُس کی ران میں گھس آتی تھی جیسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی، اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے ان کے ڈھیلے پڑتے ہی اُس کی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی......

سعد آباد کی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رفتار کینڈے پر آگئی، اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ادھر سے اُدھر کھسک کر اس نے گدے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اُس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں دروازے کی طرف کا حصہ مدوّر تھا۔ ایسا گول کہ اُس کی کمر اُس میں بالکل ٹھیک آتی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کو اس حلقے کی آغوش میں گرا دیا اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اُسے وہاں سے علیحدہ کر دیئے جانے کا خوف ہو۔ اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا، مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضا، کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیفیت بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور و ادراک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اُسے روشنی، تازگی، دلچسپی، ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسم نظر آرہا تھا، جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دُور دُور دوڑانا نہیں چاہتی تھی، بلکہ اپنی توجہ کو صرف

سڑک کے کناروں تک محدود کئے ہوئے تھی۔ اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک
نوری جادو کے زیر اثر دلفریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور عجوبے کی تلاش میں آنکھوں
کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ! دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی
تھی، اور ایک ہمیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک
کے کنارے درخت بھی تھے، مگر تیز دھوپ نے اُن کی آدھی شخصیت اپنے
اندر جذب کرلی تھی۔ لاری عجب پندار اور خود اعتمادی کے ساتھ بے نیازی سے
چلی جارہی تھی، اس کی آواز دور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلد جلد بالکل سڑک
کے کنارے پر ہوجاتی تھیں، اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے
تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف
بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار۔ اور خصوصاً بیل گاڑیوں پر اُس کی فوقیت
ڈولی کے دل میں رفعت کا احساس پیدا کر رہی تھی، اور اُسے کچھ ایسا معلوم
ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اُس کی آلودگی اوروں کی بہ نسبت کم ہوگئی
ہے۔ انجن کی بھنبھناہٹ نے اُسے دوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ
کی چیخ چاخ سے محفوظ کردیا تھا، اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس تھرتھراہٹ نے
اس کے گرد ایک اثیری حلقہ بُن دیا تھا۔ جہاں اس کے خیال کے مطابق، اُسے
کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس لیے پوری آزادی کے ساتھ اُس کے نتھنے پھول سکتے
تھے، آنکھیں چمک سکتی تھیں، ہونٹ کھل سکتے اور بند ہو سکتے تھے، اور چہرہ جو رنگ
چاہے اختیار کرسکتا تھا۔ اپنے اس قلعہ بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گذرتے
ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی، وہ کئی ٹیلوں، مزاروں، کنووں اور باغوں سے

اچھی طرح آشنا تھی، بلکہ بعض بعض درخت تک ایسے تھے جنھیں وہ پہچان سکتی تھی
رہٹ والے کنوئیں کو دیکھتے ہی اس نے بتا دیا تھا کہ اب اس کے بعد کھجور
کے پیڑ والا باغ آئے گا۔ شہر سے دو میل آگے کنجڑوں کا ایک بنگلہ تھا جہاں کچھ
مرد اور عورتیں بیٹھے سینگوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے اول تو ڈولی
کو ان لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور وحشت ناک حلیوں سے ہی کچھ کم دلچسپی
نہ تھی، مگر دو دفعہ اس نے یہاں ایک چھوٹے قد اور دوہرے بدن کی عورت دیکھی
تھی جس کی بڑی بڑی پرفن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں
اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اس پر
موٹے موٹے حرفوں میں "نامناسب" اور "مشتبہ" لکھ دیا تھا، مگر جوان ہی اوصاف
کے سبب سے قابل توجہ بن گئی تھی۔ ڈولی نے لاری سے سر نکال کر اُسے بار بار
دیکھا تھا، اور آج بھی وہ اُسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی مگر جب لاری
وہاں سے گزری تو بنگلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا، صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے
تھے مگر ڈولی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی، اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی
طرف متوجہ ہو گئی......

لیکن صرف ایک چیز تھی جسے وہاں پانے کے لیے وہ پہلے سے تیار نہ
تھی اور جسے وہاں پا کر اُسے تعجب ہوا۔ یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چاروں
طرف پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، ایک بہت اونچی چمنی سے
ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا، اور چند مزدور ٹوکریاں لیے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے
مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی نظر آ رہی تھی ——

ایسے ہی اڈے پر ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی اینٹ اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈوبی کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے رہے، بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سونگھے، اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سُنے ــــــ اِس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو جاڑے کی اُن شاموں کی طرف لے گئی جب اسکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دھواں ہلکے ہلکے اُٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا، اور بیرونی دنیا سے اُن کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا، اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور محسور خطہ بن جاتا تھا، اور وہاں کی رہنے والیاں مقید شہزادیاں۔ کھلی ہوئی باہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آ کر لگتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو، اور کندھے اور تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی گم گشتگی او اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضا تھا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سوٹ والا لڑکا اُدھر سے گزرتا تھا ــــــ جب تھوڑی دور سے بھی شکل اچھی طرح پہچاننے میں نہ آتی تھی۔ مگر وہ چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا، اور ڈوبی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ تین دن کے اندر ہی ڈوبی کو اُس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی، اور وہ بھی اُس کے انتظار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب ٹھیرے رہنے اور کم سے کم ایک بار اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ

اس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا ہو' بلکہ اُس کا چہرہ ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا
رہتا تھا۔ جب ڈولی کی نگاہیں اُس سے مل جاتی تھیں تو اُن آنکھوں کی پُرتفکر
اُداسی ایک مختصر ترین لمحے کے لیے اُس کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی
......نیلے کوٹ میں سے اُس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے
اچھے معلوم ہوتے تھے' اور اُس کے چمکدار بالوں اور پُر متانت چال کے
تصور نے اُس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا ——— وہ گرمیوں میں بھی آتا
رہا تھا' اور جاڑوں کی دھند لاہٹ جانے کے بعد اب اُس کے ہونٹ بھی
صاف نظر آنے لگے تھے جن سے اُس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اُس کے
دل کی حسرتنا کی ٹپکتی تھی ——— وہ آج بھی یقیناً آئے گا' اگر میدان کو بالکل
خالی پاکر بہت مایوس ہوگا' وہ کس طرح پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہے گا' اور ہر لمحے
اُس کی مایوسی بڑھتی جائے گی۔ وہ دو تین دن برابر آئے گا' مگر آخر اُس کی امید
بالکل ٹوٹ جائے گی...... اس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دل میں بار بار
ٹھونگیں سی مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی! جب وہ گزر
رہا ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں
میں گھر جا رہی ہے' یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ ——کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اُس کو
اتنی شدید مایوسی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا...... شاید وہ اُسے اپنی کوئی یادگار دیتیا
مثلاً وہ اپنا رومال چہار دیواری کے اندر پھینک دیتا' یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی
دیکھ نہ رہا ہوتا' اور وہ اُسے پکار کر کہتی" ذرا سنئے...... کیا آپ جانتے ہیں کہ
میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتی کیونکہ اس کا چہرہ

خود اُس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چہار دیواری کے پار چلا آتا، اور دونوں کسی
چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہ گیر بھی نہ چل رہا ہوتا۔ اور سسٹر نیس وغیرہ
سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اُس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا
اور اُسے پیار کرتا...... مگر سینما میں تو اُس نے دیکھا تھا کہ گالوں کے بجائے
ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا ہے...... اس لیے فلم کی ہیروئن کی طرح اس کا چہرہ
آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا
اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے
بعد اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ فلمی ہیرو کی طرح اُس کے
ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے...... خود ڈولی اپنے جسم کو اُس سے جس قدر قریب
ممکن تھا لگا دیتی، اور اپنے گوشت میں اُس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے
محسوس کرتی...... گرمیاں یکایک جاڑوں میں بدل جاتیں، اور ہر طرف سے
دھواں اُٹھ کر انھیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمیوں کی شام کی
واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف دینے والی عامیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں
کی پر اسراری، ابہام اور ماورائیت لے لیتی۔ بتدریج تاریک ہوتے ہوئے
لمحوں کی بے درد گریز پائی وہیں کی وہیں جم کر رہ جاتی۔ وہ ایک دوسرے سے
اپنا جسم لگائے ہوئے پیار کی باتیں کرتے رہتے، یہاں تک کہ اُن کی
یکجائی کا ایک ایک لمحہ ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا...... بخارات کی طرح
دھجی دھجی ہو کر اڑتے ہوئے اندھیرے سے جدوجہد کرنے والے اکیلے تارے
کی روشنی میں وہ کتنے معلوم آمیزش و آلائش سے پاک اور مصفا و منزہ معلوم ہوتے

لگتے ــــــ جیسے آدم و حوا عرش بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے

دن ۔۔۔۔۔ ہا بہجت و مسرت کی اس فراوان منظری کے ساتھ ساتھ ڈوبی کے

تحت الشعور میں طرح طرح کے تہدید آمیز خدشے اور وغدغے جڑ پکڑ رہے تھے

جب وہ اپنے تخیل کی سحرکاری سے اچھی طرح لطف اٹھا چکی اور کسی بچی

بچائی چیز کے کھوج میں ذرا سا رکی تو وہ فتنے اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے

یہ خیال اُسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے

بعد وہ اُسے نظر نہ آیا تو ــــــ ! ممکن ہے کہ وہ اس دوران میں کہیں باہر چلا جائے

یا اتنی دور مکان لے لے کہ وہاں سے آنا مشکل ہو جائے یا پھر کسی اور کی طرف

متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سوٹ کسی اور سڑک پر نظر آیا کرے ۔ اور یہ بھی

بالکل قرین قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد اُسے ڈوبی پسند نہ

رہے، اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پھیر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے۔

اور کیا خبر کہ وہ شروع سے ہی ڈوبی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو، اور محض تفنن طبع

کے لیے اُس سے نظر بازی کرتا رہا ہو، اور اب اس مذاق سے اس کا دل بھر جائے

۔۔۔۔۔ اگر وہ نہ آیا تو ڈوبی کی دنیا کیسی ویران ہو جائے گی. کھیل دیل میں اُس کا

جی بالکل نہ لگے گا، وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی، مگر ہر دفعہ اس کی نگاہ کسی

خوانچے والے یا کسی بڈھے ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آجایا کرے گی۔ چند دن

تو وہ رات تک ٹہل ٹہل کر انتظار کرے گی، مگر پھر اس کا دل اتنا رنجیدہ اور

بے زار ہو جائے گا، کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی اور جھنجلا جھنجلا کر

اپنے ہونٹ چبایا کرے گی، اور بولنا بالکل کم کر دے گی ۔۔۔۔۔ اُسے یہ جاننے تھا کہ

پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اُسے یاد تو کر لیا کرتا۔ مثلاً وہ دیوار کے اس طرف کوئی چیز گرا دیتی، اور اُس سے دوستانہ مگر انکسار کے لہجے میں کہتی۔ "مہربانی" سے ذرا اِسے اُٹھا دیجئے۔" جب وہ اُٹھا کر دیتا تو وہ اُس کا مسکرا کر شکریہ ادا کرتی، اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے چند لمحے ٹھٹکی رہتی، اور کئی دفعہ متشکرانہ اُس کی طرف دیکھتی تب تو یقین تھا کہ وہ اُس کے دل میں جگہ پا لیتی اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا۔...... یا پھر کسی دن ہمت کر کے اور ساری دنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کے وہ اُسے روک لیتی اور پوچھتی "کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟ کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے، یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پرواسے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟...... میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہی ہوں۔ یہاں تک کہ میرا سر مارے درد سے پھٹنے لگا ہے۔ کلاس میں بیٹھے بیٹھے بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں، اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکی ہوں۔" وہ خاموشی سے سنتا رہتا، اور آخر کہتا کہ...... مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا؟ —— یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ دونوں کسی دن ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اس سے شرماتے ہوئے کہتی۔ "آیئے، لو، لائک، ہیٹ (Love, Like, Hate,) کھیلیں...... میں سلیٹ کے ایک طرف کسی کا نام لکھ دوں گی اور آپ کو دکھاؤں گی نہیں، آپ دوسری طرف Leve یا Like یا Hate لکھ دیجئے۔" وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو (Hate) اور جب وہ اسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی، اور بے چینی سے

اُس کے لکھنے کا انتظار کرنے لگتی۔ وہ سلیٹ پر .we I لکھ دیتا، اور جب سلیٹ اُلٹی ہو جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مسکراتے ہوئے پیچھے دیکھنے لگتی، مگر اُس کے دل میں خوشی کا دریا اُمنڈ آتا، اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے۔ اور پھر وہ......

مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا؟ یا اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا

—— ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اُسے پسند نہ آئے ہوں...... کیسا اچھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا اُدھر سے گزرے تو وہ امی کا ساریشمی فراک پہنے ہو —— سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا، جس کے گریبان پر خوبصورت سی بو —— بنی ہوئی تھی...... امی نے بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھایا تھا، اور وہ اس کپڑے کی قیمت دو روپے گز بتا رہی تھی

...... دام گو بہت زیادہ ہیں...... مگر ایسا بھی کیا ہے...... جب وہ گھر پہنچے گی تو اُس کی ماما کہیں گی: "ڈولی، دیکھو تمھاری آنٹی نے آگرے سے تمھیں فراک بھیجا ہے۔" اور جب وہ فراک نکال کر لائیں گی تو وہ بالکل ویسا ہی ہوگا...... یا پھر وہ یوں کہیں گی: "تمھارے پاپا دلی گئے تھے۔ وہاں انھوں نے کپڑوں والے کی دکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ ڈولی کے لیے لیتا چلوں۔ بڑا استا مل گیا وہ۔ بس ایک فراک کا ہی تھا۔" وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی، اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہوگا...... وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا ترشوائے گی، اور گریباں پر سیپ کے نیلے بٹن ٹکوائے گی۔ جب وہ اُسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہوگی۔ وہ اُس دن دوپٹہ بالکل نہ اوڑھے گی ا ور اں تو دوپٹے سے گریبان کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے

دوسرے دوپٹہ کیا ہوتا ہے۔ عذاب جان ہوتا ہے، ہر وقت سنبھالتے رہو ہاتھ
اِدھر اُدھر ہلاؤ تو پھنس جائے۔ یہ مسلمان سے گلے لگتے ہیں دوپٹہ اوڑھ کر......
یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے باہر جاؤ تو دوپٹہ اوڑھ کر جاؤ، ساڑھی نہ پہنو،
میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ...... وہ میٹرن ایک چڑیل ہے، ذرا سامنے سے
کھسکنے نہیں دیتی۔ گرجا سے لوٹتے ہوئے کتنی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے
اندر سے ہو کر چلے، مگر میٹرن نے ایک نہ مانا۔ اور کھیل کے میدان میں بھی
ایسی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو...... اور
وہاں ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلس ہائی سکول
کی لڑکیاں بھی تو ہیں۔ وہ کیسی رنگ برنگی ساڑیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں
دس بجے...... یہاں صبح پانچ بجے ہی اٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اُٹھنے میں
دیر کرو تو ایک چیخ پکار، آفت چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہو رہی ہوں
مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ۔ یہ بھی تو نہیں کہ اِس کے بدلے ایک ٹکیا ہی
زیادہ مل جائے۔ وہاں تو الٹی میٹرن صاحبہ چلاتی ہوئی آئیں گی "اس مہینے میں
گھی بہت خرچ ہو گیا۔ مجھے دکھا کر لیا کرو روز" اور پھر اوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی
ضدیں۔ "وہ لیں گے ہم، وہ بڑی ہے" "کام کے وقت تو پڑی سوتی رہیں، اور
جب سب ناشتہ واشتہ تیار ہو گیا تو چلیں نخرے کرتی وہ۔ یہ جی چاہتا ہے کہ
بس دھمک دے اُٹھا کے، اور کچھ نہ کرے۔ یہ سب ہنگامہ ختم ہو کے چکے
تو پھر چلو اسکول۔ وہاں الگ مصیبت۔ سوال کیوں نہیں کئے؟ مضمون کیوں
نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کچھ کیا بھی جائے۔ پلنگ پر پڑکے بھی تو

چین نہیں ملتا، حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز نہ سنائی دے.......
اور ہاں اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو۔ کھانا پکاؤ۔ اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو۔ میلے میلے، اُلجھے ہوئے سر، جنھیں چھونے کو بھی جی نہ چاہے بیٹھے کرید رہے ہیں۔ انھیں...... کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے۔ تو میم صاحب ساتھ، انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پکارتی چلتی ہیں "پلیز، کھم ٹو می" (Please come to me) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دہراتی ہے۔ اگر میم صاحب نے سُن لیا کہ کسی لڑکی نے "کھم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اب اُس کے پیچھے ہیں، جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آجاؤ...... اُس کے مقابلے میں گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں، جیسے کپڑے جی چاہتا ہے پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک...... اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیا مزا رہتا وہ اطمینان سے سُلا کر اُٹھتی اور اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اُس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی، اور اُس کی کہنی باہر نکلی رہتی۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑتی جاتی، اور ساری دنیا اُس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی...... مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں کے پانچ روپے لئے جاتے تھے۔ حالانکہ یہاں وہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی...... فیس زیادہ ہی سہی، مگر اس کا وہاں داخل ہو جانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا.....

گھر جاکر وہ پاپا سے کہے گی کہ وہ گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے
پاپا تھوڑے سے اصرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ
اپنا سرٹیفکٹ لینے اسکول جائے گی۔ وہاں اُسے ایمی ملے گی...... ایمی کتنا
بنتی ہے۔ دیکھو تو زرد، دبلی، پتلی، جیسے بھوکوں ماری بلی اور اپنے آپ کو خوبصورت
سمجھتی ہے بھلا! اسٹیشن پر کیسا بن ٹھن کر چل رہی تھی۔ ٹرین میں سے ہر گزرتے
ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دیوانہ ہی تو ہو گیا
ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔
اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی، اُن کی قیمتیں بتائے گی، طرح طرح سے یہ
جتائے گی کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے، اور سب دوسروں کی معاف ہے
اسٹیشن پر بھی جب دوسری لڑکیاں ملائی کا برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں
ریشمی رومال ہلاتی ہوئی اسٹال پر گئی تھی۔ اور ایسی آواز میں کیک اور لیمنیڈ
مانگا تھا کہ سب سُن لیں...... ایمی اُس سے پوچھے گی "سرٹیفکٹ کیوں لے
رہی ہو تم، ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے جواب دے گی۔ "میں تو اب گورنمنٹ اسکول
میں جا رہی ہوں"! ایمی اُس کی طرف رشک سے دیکھتی رہ جائے گی، اور وہ
وہاں سے کندھے اور سر اُٹھائے چلی آئے گی، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی
پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلس ہائی سکول جایا کرے گی۔
—— اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، روز طرح طرح کی ساڑھیاں پہن کر ——
—— کپڑوں کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ دراصل وہ سبز پھولوں والے فراک
کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ جب وہ پہلے پہل وہ فراک

پہنے گی تو اس دن نہا کر اچھی طرح بال بنائے گی، اُن میں گلاب کا پھول لگائے گی، چہرے پر سیل کھڑی (جو اس کے یہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) ملے گی، اور جوتے کو پالش سے خوب چمکائے گی۔ اسی دن وہ اپنے چار آنے والے بُندے بھی نکالے گی جن میں اُودی گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کرے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ جمیلہ کے یہاں جائے گی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے راستے میں اُسے طاہر، ایوب اور دیپ چند ملیں گے ان کی یہ ہمت تو نہ ہوگی کہ اُس سے کچھ بولیں، مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اُس کی طرف گھورنے لگیں گے، آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے، اور اُن میں ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسروں سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی اس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا، اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزری چلی جائے گی۔ تاہم اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا ہوگا۔ اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑ پھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو روک سکے گی۔ سقّے کی شبراتن بھی اس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہوگی۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر بڑی متعجب ہوگی۔ وہ آہستہ سے پکارے گی "ڈولی"! اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلائے گی۔ مگر ڈولی اس کی طرف ذرا سا مسکرا دے گی، اور آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ اور جمیلہ تو بالکل

بھوت رہ جائے گی۔ وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی، اور اس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا۔ وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی جیسے اپنے تنگ پائنچوں کے پاجامے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جائے گی، اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اس کی اماں بھی مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھیں گی، اور فقرہ چست کرنے کی فکر میں کہیں گی: "اوہ، آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو، ڈولی!" پھر جمیلہ کی بھی زبان کھلے گی: "ہاں، ڈولی، آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو!" وہ اُس دن جمیلہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اُس کے فراک پر دھبہ لگ گیا تو؟ وہ بس ایک جگہ جا کر پلنگ پر بیٹھ جائے گی، اور تھوڑی ہی دیر میں چلی آئے گی یہ کہہ کر: "اچھا، اب تم کام کرو گی۔ میں چلوں...... وہ جمیلہ کو بتائے گی: "اسے بو کہتے ہیں"۔ وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی، اور کئی انگریزی لفظ بولے گی جنہیں سن سن کر جمیلہ بہت مرعوب ہو گی، اور شرم کے مارے اُن کا مطلب بھی نہ پوچھے گی، بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں، وہ سب سمجھ رہی ہے...... بالکل جاہل ہے جمیلہ بھی۔ پاوڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا اردو تک تو آتی نہیں اُسے۔ اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت وہ کہ ہم بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کپڑے کو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اُس کے کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں، اور اُن میں سے پسینے کی بو آتی رہتی ہے۔ بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر اُن میں کنگھی ہی کر لے.... شاید عید کے

دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو تو پہنتی ہو۔ اب کی عید کو اُس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جاکر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں، مگر وہ اس خیال سے رُک گئی کہ کہیں اُسے ندیدہ نہ سمجھا جائے .... اُس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سویاں آئی تھیں، اور اگلے دن جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا "تم کل نہ آئیں۔ ہم تو تمھارا انتظار کرتے رہے۔ آتیں تو ہم تمھاری دعوت کرتے"...... جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر بے بلائے نہیں جایا کرتے....... وہ اب کے کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی، اور انگریزی میں رقعہ لکھے گی جسے ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جا سکتا ہے۔" رقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے گی، اور پوچھے گی "کیا ہے یہ؟" تب وہ اُسے مطلب سمجھائے گی...... مگر جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں...... تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابا سے کہے گی کہ وہ اُسے جانے دیں۔ اُس کے کہنے سے وہ اجازت دے دیں گے۔ پھر جمیلہ آئے گی رات کو، برقع میں لپٹی لپٹائی، سمٹتی ہوئی۔ وہ اُسے کرسی پر بٹھائے گی۔ جمیلہ کو میز پر بیٹھ کر کھانا عجب معلوم ہوگا، اور وہ کچھ سٹ پٹاسی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اُس کی طرف چمچہ بڑھائے گی "لو، لو چمچے سے کھاؤ"۔ جمیلہ بڑی شرمندہ ہوگی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گی وہ جمیلہ کو فلموں قصے، اسکول کے کھیلوں کا حال، اور میم صاحب کی باتیں سنائے گی جو اُسے پریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہوں گی جہاں کی سیر کا وہ خیال تک نہیں کر سکتی۔ خصوصاً یہ سُن کر اُسے بڑی حیرت ہوگی کہ فلم دکھانے سے پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے...... میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل میں تعجب

کر رہی ہو گی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک بڑھاتے ہوئے
کہے گی۔ لو کیک لو....... کیک ہے۔ انگریزی ہوتا ہے یہ اِسے انڈوں سے
بناتے ہیں" وہ یہ بھی پوچھے گی" تم نے چاکلیٹ کھائی ہے جمیلہ؟......
انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ...... اِتی بڑی بڑی تختیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی
مزیدار ہوتی ہے۔ ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی ہیں...... وہ اُسے یہ بھی
سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنی ہنستی ہیں، گاتی ہیں، مذاق کرتی ہیں، اور کیسا
کیسا لطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے گی، اور کچھ کھسیانی سی ہنسنے لگے
گی...... وہ جمیلہ کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا......

ایک مٹھی ریت آکر اُس کے چہرے پر اس بُری طرح گرا کہ اُس کی
آنکھیں اور منھ کرکرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ اور درخت دیوانہ وار
ہل رہے تھے۔ آسمان گرد سے بالکل اٹ گیا تھا اور خالی کھیتوں میں دور دور تک
بگولوں نے اُٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا گویا اُنھوں نے ایک
دوسرے سے شرط باندھ رکھی تھی۔ بھرے کی طرح چکر بناتے ہوئے اوپر چڑھنے کے
باوجود اُن کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جا سکتا تھا، مگر نیچے گرنے میں
اُن کی سستی، ٹھہراؤ، نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابل برداشت تھی بعض
بعض دفعہ تو وہ ایسے معلق ہو جاتے تھے گویا اُنھوں نے بالکل ہمت ہار دی ہے
اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ اُن کی کاہلی دیکھ دیکھ کر ڈولی اپنے آپ سے
تنگ ہوئی جا رہی تھی، اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیشے پر مکّا مارے یا کوئی
ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ معلوم ہو کہ اُس کے اندر زندگی

ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے یا صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی
تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پار تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب
قریب بچھی ہوئی نظر آتی تھی۔ خشک اور تر کا یہ میل گنجی چاند کی طرح ایسا گھناؤنا
تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کھیت اُس کے پیٹ میں سے
اُٹھ کر حلق میں اڑ گئے ہیں اور اُسے قے سی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت
اُس کی بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر کی طرح اڑتے ہوئے آتے تھے جیسے اُس کے
دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں گے، مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے
بچ کر نکل جاتے تھے۔ ڈولی اس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اُس کا سر پھوڑ دیں، مگر
اُس کے لیے یہ پُر فریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا سر درد سے
پھٹا جا رہا تھا، اور آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے ڈیلے
جل رہے تھے۔ اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے الٹی چبھن ہوتی
تھی۔ پیچھے بیٹھنے والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے، اور اتنے لوگ
ایک ساتھ مل کر بول رہے تھے کہ لاری مینارِ بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی
آواز دوسروں سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ارے جناح، جناح۔۔۔۔۔۔
جناح نے تو وہ کیا جو۔۔۔۔۔۔ چند آدمی "کسان۔۔۔۔۔۔ کسان۔۔۔۔۔۔"
کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے، مگر دوسرے آدمی اُن کی
بات کاٹ کر خود بھی "کسان۔۔۔۔۔۔ کسان۔۔۔۔۔۔" کہنا شروع کر دیتے
تھے۔ ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کرے، مگر پھر بھی کوئی
نہ کوئی لفظ ضرور آ کر اُس کے مغز میں ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ

غوں، غوں مچا رکھی تھی جس کی دھن پر چکر کھاتے کھاتے اس کا سر بالکل مفلوج
ہو گیا تھا، اور گرا پڑ رہا تھا .... اُس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی، مگر اس کے
پپوٹے اب ڈلوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اُس نے ہر چہ بادا باد کہہ کر
اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا، اور بالکل بے حرکت ہو گئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا
حصہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چپک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا، اور اُس کی
آنکھیں آخر بند ہو گئیں .... نیند میں ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھنبھناہٹ
صاف سن رہی تھی، اگر وہ اُس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اُسے
لوری دے رہی تھی اور دوسری مداخلتوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی
تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر اُس سے زیادہ اُسے
زمان و مکاں کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی، وہ کسی لطیف
شے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی۔ بلکہ محض ایک شناخت، صرف ایک خیال —
"میں" — باقی رہ گیا تھا۔ اُس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی تھی جس میں
کبھی کبھی پھیکی سی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے، زیادہ سے زیادہ وہ
یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھن بھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے صرف ایک دفعہ
اُسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا تھا جسے اُس نے پہچان لیا
تھا کہ آئرین کا ہے، مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا، اور اندھیرے
کی روانی پھر اُسی طرح جاری ہو گئی تھی ......

لاری کے ایک دھچکے سے اُس کی آنکھ کھلی۔ لاری ایک گاؤں کے
پاس سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت

کھی مٹی کاٹ رہی تھی، اور دوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا
جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اٹھا اٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی
تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے، اور انتظار کر رہے تھے کہ
لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگیں
ڈوبی کا درد تو اب اچھا ہو گیا تھا، مگر سر بھاری تھا، اور آنکھیں نیند کی وجہ سے
اچھی طرح کھل نہیں رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ زکام سا بھی ہو گیا تھا
جس کی وجہ سے اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا
ہے اور اس کے بجائے تھوڑی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اُس نے گردن
اکڑا اکڑا کر انگڑائی لی، اور سڑک کے نظاروں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ
اُس کی گرانی کچھ دور ہو جائے۔ گاؤں سے تھوڑی دور آگے ایک بچہ روتا ہُوا
جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چپ ہو گیا، اور اُس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے
کرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اُوپر اٹھا لیا، اور لاری کی طرف دیکھنے
لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد دوپٹہ دانتوں
میں دبا رکھا تھا، اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈوبی کو
اُس کے پیلے پیلے دانت بالکل پسند نہ آئے، اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف
دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے
ہی نہیں ہیں۔ وہ تو گویا ہوا میں معلق تھے اور ایک تعجب خیز ہم آہنگی کے
ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے ...... مگر ان چیزوں کے ساتھ
وہ اپنی مصنوعی دلچسپی کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی، اور اُسے یقین ہو گیا کہ اپنا

دل بہلانے کے لیے اُسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور واقعوں کو رد کر دینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ صرف "غزل الغزلات" ہی اس کی کار برآری ہو سکتی ہے جس سے اس کا تعارف برنس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائبل لیے ہوئے اُس کے پاس آئی تھی، اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اُس سے کہا تھا "تم نے یہ دیکھا ہے، ڈولی؟" اُس نے "غزل الغزلات" کا ایک صفحہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا تھا، اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخن کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اُس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے پوری "غزل الغزلات" کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا، اور ڈولی نے اکیلے میں بھی، یہاں تک کہ اُسے کئی مزیدار حصے یاد ہو گئے تھے، اور اُس کے کتنے ہی ویران اور آزردہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے ...... اُس دن کہ جب اُسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اُس کی طرف دیکھتا ہوا چلتا ہے، وہ رات کو پلنگ پر لیٹی دیر تک ان حصوں کو یاد کرتی رہی تھی۔ اُس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں، باہیں تکیے کے دونوں طرف پھیلا کر الٹی لیٹ گئی تھی، اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کی پوری قوت سے دبایا تھا جن کی ہلکی سی کسک میں اُسے انتہائی لطف ملا تھا ...... ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اُس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کہیں لاری میں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ـــــ جیسے وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ عریاں کرنے والی ہو۔ اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو جملے دہرانے شروع کر دیئے تاکہ وہ ہر

ایک سے پوری طرح فیضیاب ہو سکے"۔ ...... ہماری ایک چھوٹی بہن ہے
ابھی اُس کی چھاتیاں نہیں اُٹھیں ...... تیری دونوں چھاتیاں وہ آہو بچے
ہیں۔ تیری ناف گول پیالہ ہے ...... وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے
چومے ...... میرا محبوب جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے
...... میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹ کھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے
لیے دروازہ کھول، میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری! دیکھ تو خوب رو ہے
دیکھ تو خوبصورت ...... اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے اور اس کا
دہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے ......" اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں
میں جب ایک دن فریڈی کہانیاں سنتا سنتا اُس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات
بھر اُس کی گردن میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی، اور اُسے بڑی
گہری نیند آئی تھی۔ اس لیے اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب کے چھٹیوں بھر فریڈی کو
اپنے پاس سلائے گی ...... ایسے ہی جب ایک دفعہ برنس اس کے ساتھ
سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگلے دن صبح کو عیسائیوں
کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لیے وہ دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر
چور ہو گئی تھیں، اور انھیں پھر صبح سویرے اُٹھنا تھا۔ برنس کا تو اتنا برا حال تھا کہ
اس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا اِس لیے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی، بلکہ ڈولی کے ساتھ ہی
سو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہو گئیں۔ مگر پھر نہ
جانے یہ کیسے ہوا کہ اُن کی باہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں
اُلجھ گئیں ...... صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں اور انھیں اپنی کیفیت دیکھ

تعجب بھی ہوا۔ مگر اُن کے سینے مل رہے تھے، اور اُن کے گلگلے پن اور نرماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اُٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرما اور لجا نہیں رہی تھیں بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو ...... وہ دونوں جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب تھے، اُن کے بعد مرد، پھر عورتیں، پھر لڑکیاں، اور آخر میں پھر مرد وہ اور برنس دونوں ایک لائن میں چل رہی تھیں، اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے باتیں کرتی جاتی تھیں سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے، اور گانے کے ٹکڑے لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کے دو دو تین تین کے مجموعے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں اور مشین کی طرح اُٹھا اور گر رہے ہوں" ...... ہاتھوں میں میجنس گارڈ کرسوی پہ چڑھا دیا ...... یسوع نے تیرے واسطے اپنا لہو دیا ...... اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا۔ یشو یشو من میں آجا، ہم کو بچا جا، پاک بنا جا ...... یہ گانا اُسے اچھا تو معلوم ہوتا ہے، مگر خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو؟ اُسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا جو ہاکی اسٹک لیے سائیکل پر جا رہا تھا جلوس کو دیکھ کر اتر پڑا تھا، اور اُس کی طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے پانی میں سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنستا تھا تو اُسے اتنی نفرت ہوئی تھی کہ اُس نے ڈوپٹہ سر اور چہرے پر کھسکا لیا تھا، اور بہت دیر تک خاموش نیچی نظریں کئے ہوئے چلتی رہی تھی ......

ہاں ایمی جلوس کے دن بڑی خوش رہتی ہے۔ اُسے اپنے کپڑے اور خوبصورتی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں...... اُس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی اس کی چاپلوسی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مِسٹن کا ولیم سنگھ بھی۔ آج بھی جب کہ وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ایمی کی خوشامد میں لگا رہا تھا۔ اور دوں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکلنے پر بھی ٹوک دیتا تھا، مگر ایمی سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھر رہی تھی۔ اور وہ اُسے ایک لفظ نہ کہہ رہا تھا...... اور اب تو وہ اپنے آپ کو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آئرین نے اُسے بتایا تھا کہ ایمی کو اب کے فرسٹ آنے کی اُمید ہے۔ کہیں آئی نہ ہو! ...... اب تک ہمیشہ ڈوَبی فرسٹ آتی رہی ہے، اور اس دفعہ تو مس جونس نے اُسے اپنے گھر بلا کر پڑھایا تھا...... بہت ہی اچھی ہیں مس جونس! ان کا جوان ہنس مکھ چہرہ، اور اس پر سنہری عینک، کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر اُسی کو دیتی ہیں، اور اُس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ امتحان کے قریب بے چاریوں نے خود اُسے بلا کر پڑھایا تھا، اور اس سے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی اُن کے پاس پڑھنے آیا کرے۔ ایک دن جب وہ ان کے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی وہ اُس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں، اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں...... جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں کہ اُس کا جی چاہتا ہے ہلکے سے

اُن کا گال چوم لے۔ کتنی مرتبہ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اُن سے کہہ دے کہ وہ اُن سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انھیں اپنے سینے سے لگائے اور اپنے بازوؤں میں لیے رہے۔ مگر وہ ہر بار شرما کر رہ گئی ہے اور اُن سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی ہے...... ایک مرتبہ وہ اُسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں۔ وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی.... اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے...... اُن کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی، ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لیے ترستی ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے، اسکول والے کم بخت ذرا نہیں نکلنے دیتے۔ ایمی سے "اچھوت کنیا" اور "پکار" کی تعریف سُن کر اس کا کیسا کیسا جی ہوتا ہے کہ کسی طرح اُسے بھی دیکھنے کو مل جائے مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی...... اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا مل جائے...... وہ مس جونس ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے...... یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی ہو، اور یکایک اُس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آ کھڑے ہوں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہوں گے اور اُن کے سنہری عینک لگی ہوگی۔ لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر اُن کی طرف دیکھیں گی۔ اور یہ پوچھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اُسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور پھر پڑھنے سے اُن کا دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے، وہ کن آنکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی۔ وہ اُس سے کہیں گے: "ڈولی میں ابھی ابھی آ رہا ہوں۔ آج کل

یہاں "اچھوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما"۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو جائے گی، اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اُن کے ساتھ سینما جائے گی ...... جوزف بھائی کے سنہرے بال کیسے چمکتے ہیں، اور ان کے گورے رنگ پر نیلا سوٹ تو بہت ہی سجے گا ...... وہ سینما ہال میں بیٹھی اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہوگی، اور اتنی خوش ہوگی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا ــــ بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے ــــ جسے امی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے، کس موقع پر گایا جاتا ہے۔ گھنٹی بجے گی اور ہال میں اندھیرا چھا جائے گا، اور پھر پردے پر ......

سامنے وہ سفید دھرم شالا نظر آ رہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آ گیا ہے۔ اس علم کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ اُسے وہ نیا مکان زمین سے ابھرتا ہوا دکھائی دیا جو اڈے پر بن رہا تھا، اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین کے باہر نکل آیا۔ اس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی، مگر اب اُس میں کچھ تمکنت، خود اعتمادی اور تفکر کا سکوت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ اب وہ خواہ مخواہ گُن گُن نہ کر رہا تھا، بلکہ اس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیرے میں کھینچ لیا تھا۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا، اور اس میں سے چھت بہت اونچی نظر آ رہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر اتنا اونچا کر دے کہ اندھیرا اُسے ڈھک لے ...... ڈولی نے اپنا اوپر کا جسم اٹھا کر لاری کے باہر پھینک دیا جو شیشے میں سے سورج کی کرن کی طرح آسانی سے نکل گیا، اور ڈولی کی طرف منہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا ...... وہ گویا

نصف مجسمہ تھا، حالانکہ اُس کے رنگ میں سنگ مرمر کی سی درشتی نہ تھی، بلکہ اُس کے رنگ عین زندگی کے رنگ تھے۔ یہ مجسمہ بالکل عریاں تھا۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی، مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا، خصوصاً اُس کی کن پٹیوں کے پاس کے حصے اب اتنے ابھرے ہوئے نہ رہے تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ربطی نہ تھی، بلکہ وہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ میانہ وار اوپر سے نیچے آرہے تھے۔ پیشانی بھی کشادہ تھی، اور اُس کی مہین لمبی پلکیں نیچے جھکی ہوئی تھیں اُس کی آنکھیں بھرے بھرے صاف شفاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی، انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شانوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں جو بے داغ، نرم گلابی رنگ کی، موزوں، متناسب، بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی گدگدی سے پرجوش نہ تھیں، بلکہ سب سے اونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام، قرار، جمالیاتی غور و فکر، اس سے منتج سرشاری، اور عبودیت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے"......

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اُسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لیے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اس کے یہاں کیا ہو رہا ہے...... شاید "ماما" گردوں کا سایہ پہنے جھاڑو دے رہی ہوں...... شاید پاپا بازار سے لکڑیاں لے کر آئے ہوں، اور ماما اُن پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بھیگی ہوی آواز میں آنٹی کی خوش نصیبی کا

تذکرہ کر رہی ہوں، اور اس کے مقابلے میں اپنی ...... مگر ڈوبی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اِن چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گزارے جا سکتے تھے، خیالات کی اس روش سے مکدر کرے۔ چنانچہ اُس نے نئی ریل چڑھائی ...... فریڈی اپنا نیلا نکر اور ہری قمیص پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہو گا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا، اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا ...... پاپا ابھی دورے سے واپس آئے ہوں گے، اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔" وہ پوچھیں گے "ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر انھیں بتائے گا۔" ڈوبی بُوا آگئیں پاپا!" وہ کہیں گے۔ "تو آگئی، بیٹی ڈوبی؟" اور وہ جواب دے گی "جی ہاں پاپا"...... ماما باورچی خانے میں اس کے لیے کوئی اچھی سی چیز تیار کر رہی ہوں گی۔ آواز سن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی "آگئیں تو ڈوبی بھی! میں تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہو گی تمھارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں، شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمھیں روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈوبی بوا کے آنے میں کے دن رہ گئے ......

اور آج تو وہ صبح سے ہی تیار پھر رہا تھا"...... ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اُسے بتائیں گی کہ اُس کے پاپا اس کے لیے ایک چھوٹی سی سفید بلی لائے ہیں جس کی اُسے بڑی خواہش تھی ......

سوچنے کو تو وہ سوچے چلی جا رہی تھی، مگر ویسے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے پھر بھی وہ اس آخری تنکے سے چمٹی ہوئی تھی، اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اس کے دل پر چرکا سا لگتا تھا۔ اور اُس کے گلے کی رگیں چٹ چٹ

بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دور ہے، مگر اُسے اُس کے خلاف ناقابلِ تردید شہادتیں ملے چلی جا رہی تھیں وہ امید کر رہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکل چلی جائے گی اور پھر کبھی نہ رکے گی، یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اُسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ مگر یہ علم اس کی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز رکاوٹوں کو توڑتی کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو، اور اُسے قصبے کے اڈے پر لا کر کھڑا کرے گی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اُس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی بھنبھناہٹ پر خود ہی مست ہو کر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی، اور اُسے ڈوبی کے جذبات کی مطلق پروانہ تھی ڈوبی بے چاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، اور اُسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے ......

آخر اُس نے ایک گہرا سا لمبا سانس لیا اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ....

اڈے کے قریب پہنچ کر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اُس کی امید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے۔ ورنہ کم سے کم تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے۔ مگر جلد ہی کلچ ایک درشت کڑکڑ کے ساتھ بولا اور انجن رک گیا۔ ڈوبی کے کانوں میں خاموشی بھر بھرانے لگی، اور اُسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اُتر رہے تھے، مگر وہ

ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آکر اس سے پوچھا کہ باجی سامان چلے گا؟ تو اس نے ٹھنسے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد "ہاں" نکالا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا۔ جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو، اور آخر کار اس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لیے راضی کر لیا ہو.....

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اتروا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اسے اس خیال سے بے چینی ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت ڈولی کو اس وقت اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیا نہیں کر رہے، وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اسے ان کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے۔ اس لیے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدھم ہو گئی تھی، اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً سرسرائے جا رہی تھیں۔ زمین کا غبار اٹھ اٹھ کر آسمان پر پھیل گیا تھا، اور اس نے آسمان کو بالکل گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اس عریض چادر پر سورج کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی، اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ الٹا اور دھول میں آتا جا رہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی، اور وہ پھٹی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے ان سے ساتھ دغا کی ہو، اور اب ان میں گلے اور شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو......

اختر انصاری

لو ایک قِصّہ سُنو!

اختر انصاری محبت کے سادہ اور شیریں نغمے الاپنے والا باکمال شاعر ہے لیکن اس کے افسانے پڑھے جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعری اُسے چھو تک نہیں گئی۔ ذہنی افتاد کے ایک پہلو سے اس حد تک بیگانگی تعجب انگیز بھی ہے، اور قابلِ ستایش بھی۔ وہ واقعاتی افسانوں کا قائل نہیں معلوم ہوتا اس کے افسانے کرداروں کے گہرے مطالعے ہوتے ہیں، اور اس کا بے رحم قلم تخیل کو سچائی پر کبھی فوقیت نہیں دیتا۔ زیرِ نظر افسانہ ایک طویل خط ہے، جو بیان کی خوبصورتی اور زبان کی چاشنی کے علاوہ اسلوب کی پاکیزگی اور ماحول کی غیر اجنبیت کے لحاظ سے اُس کے سب افسانوں سے ممتاز اور نمایاں ہے، اس مطالعہ میں وہ بورژوا طبقے کے ایک نوجوان کے متعلق ایسے ایسے حقایق پیش کرتا ہے، کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے ذہین تعلیم یافتہ نوجوانوں کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اختر کے اس تاثر پارے کے بغیر نامکمل تھا۔ اختر اپنے کرداروں کا ایسا گہرا اور ہر جہت سے مکمل مطالعہ کرتا ہے، کہ وہ ہمیں نامانوس معلوم نہیں ہوتے بلکہ جیسے اختر نے اپنی ساری عمر ان کے مطالعہ میں صرف کر دی ہے، اور جیسے ہمارے ساتھ بھی اُن کرداروں کا کوئی ذہنی لگاؤ ہے،

"میں برہما میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان واپس آ رہا ہوں!"

چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے برما سے آچکے تھے، میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گذر چکے، تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لے کر کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھا، اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا تاکہ بتن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر برہما میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

بتن میاں! خدا تمھیں خوش رکھے! تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو۔ لیکن میں اُس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لیے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمھیں خوش رکھے، نیک اعمال کی توفیق دے اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے! آمین! لو، ایک قصہ سنو! "ایمان کی روشنی" پر یاد آگیا۔

بہت دنوں کی بات ہے، میں برسات کا لطف اٹھانے کے لیے مہرولی میں یوسف کے ہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ ہانپتے

کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی، اور کہیں اُن کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں۔ عورتیں برقع پوش ضرور تھیں، مگر اُن کے چہرے بے نقاب تھے، اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتی، اور "اوئی اللہ" اور "ہے ہے" کی دلفریب چیخیں بلند کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے بنّن میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے، یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کریں، اب اُس زندگی سے دور ــــــ بلکہ بلند! ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر، تو نوجوانوں کی اُس ٹولی میں ایک بگڑے دل بھی موجود تھے۔ دو چار گوری چٹی صورتیں جو دیکھیں تو اُتر آئے شرارت پر۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے "اماں یار، روشنی تو یہاں بہت ہے، پھر لالٹینوں کی کیا ضرورت ہے؟" اُن عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اُس نے پٹ سے جواب دیا "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہیے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلدی بجھ جائیں گی۔" نہ پوچھو کیا حال ہوا سننے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کیا منھ توڑ جواب دیا ہے بڑھیا نے! کمال کر دیا۔ سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کم بخت! تو غرض یہ ہے بنّن میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تمہید کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو ماموں جان کے خطوط سے اور خود تمہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھائیوں میں

تمہارا جی نہیں لگتا، اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو میں نے اپنے پچھلے خط
میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔ اِس سے اُن فائدوں کے
علاوہ جو مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اپنا وقت
آسانی کے ساتھ کاٹ سکو گے۔ لیکن تم نے میرے اس خیال کو مہمل سمجھا۔ بات بھی
ٹھیک ہے۔ پڑھنے سے تمھیں دلچسپی تھی ہی کب جواب ہوگی۔ جب طالب علمی کے
زمانے میں نہیں پڑھا اور لغو سیاسی مشاغل میں وقت ضائع کیا تو اب کیا خاک
پڑھو گے۔ تم کو پڑھنے کا مشورہ دینا واقعی ایک فضول اور مہمل سی بات ہے۔ مگر
بنّن میاں! تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں چونکہ بھاموجیسے وحشت خیز
مقام پر نہیں رہا ہوں، اور گھر سے نکل کر کہیں گیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں، اس لئے
تمھاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ یقین مانو میں تمھاری دماغی
حالت اور قلبی کیفیت سے اتنا واقف ہوں جتنے تم خود بھی نہیں۔ اِس کی وجہ
یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحبِ کرامات بزرگ ہوں اور غیب کا حال جانتا ہوں
بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور یہ آفت مجھ پر بھی
بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی شکایت
نہیں کرتا کہ تم نے میرے اوپر ایک ہلکی سی چوٹ کی اور ایک لطیف طنز سے
کام لیا، بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی موافقت میں کوئی بات نہیں
کہی، جو کچھ کہا میری موافقت میں کہا۔ سوچ سمجھ کے بات کیا کرو بنّن میاں!
کیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اُس کے دوسرے دن لندن سے متنفر
ہو گیا اور وطن کی یاد میں آنسو بہانے لگا؟ تہذیب جدید کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی

گوناگوں رعنائیوں دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود میری توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چند ماہ نہایت بدمزگی کے ساتھ گزارے اور ہندوستان واپس آگیا میری زندگی کے اِس افسوس ناک واقعے سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟ یہی ناکہ پردیس میں جی کا لگنا پردیس کی رنگینی یا بے رنگی پر منحصر نہیں۔ اگر آپ بھاموں میں رہ کر وطن کے لیے بے قرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے بنّن میاں! کہ انسان جب اپنے وطن اور اہلِ وطن سے جدا ہو کر کسی اجنبی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر "ہوم سِک" ہو جاتا ہے "ہوم سِک نِس" ایک عام مرض ہے اور بہت سے "غریب الوطن" اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اِس میں بچوں بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کی تخصیص نہیں نہ بھامو اور لندن یا مسقط اور پیرس کی تخصیص ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اُس زمانے میں وہاں ایک ہندوستانی ریستوراں "کوہِ نور ریستوران" کے نام سے جاری تھا۔ یہ ٹاٹنہم کورٹ روڈ یعنی لندن کے عین مرکزی علاقے میں واقع تھا۔ دو بھائی جو ہماری اپنی دہلی کے ایک کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اِس کو چلا رہے تھے۔ میں تو لندن پہنچ کر دہلی کے لذیذ اور چٹپٹے کھانوں کو ترس ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی، شامی کباب، روغن جوش اور مٹیا محل کی نہاری کے مزے یاد آتے تو سچ مچ منہ میں پانی بھر آتا۔ چنانچہ "کوہِ نور" کا کھانا میرے لیے حقیقتاً نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کئی میل کا سفر کر کے وہاں پہنچتا اور ان کا ڈھائی شلنگ کا ڈنر کھاتا۔ کسی اور دن جاؤں یا نہ جاؤں، اتوار کو ضرور جاتا تھا،

کیونکہ اُس دن جلیبیاں بھی ڈنر کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو بتن میاں! قصہ یہ ہے
کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اُس وقت میرے سوا
وہاں کوئی اور نہ تھا، کیونکہ اصل میں ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا اور میں
جلیبیوں کے لالچ میں ذرا وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ میں نہایت اطمینان
کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔
میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اِس سے زیادہ
دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں
لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورنا یا اُن کے
کاموں میں دخل دینا وہاں بد تہذیبی خیال کی جاتی ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ
اِن فضول باتوں کے لیے اُن کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب
آئے اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا
اور اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اُچٹتی ہوئی نظر اُن کے چہرے
پر پڑ گئی ہو تو اُس کی مجھے خبر نہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹر آیا اور یہ پوچھنے کے
لیے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضر کی جائے ان کے پاس گیا۔ جونہی اُن کے
منھ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں اُن کی آواز پہچانتا تھا! آواز کو یاد
رکھنے میں میرا حافظہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ لو، ایک قصہ سنو!
یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے ابا کے
ہاں جا رہا تھا علیگڈھ سے جو گاڑی ملی اُس میں بہت بھیڑ تھی۔ انٹر کھچاکھچ بھرا
ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے تھرڈ میں جگہ ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔

اتنی بھی گنجایش نہ تھی کہ آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے ہو وہیں بت بنے بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ خیر بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ علیگڈھ کے اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ ڈبے میں ایک سحر آفریں نغمہ بلند ہوا۔ کیا خبر تھی کہ مسافروں کی اِس بھیڑ میں ایک جادو نوا مغنی بھی ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا، اور چونکہ میری پشت اُس کی طرف تھی میں اُس کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ اُس کے گانے کو "سرود خانہ ہمسایہ" سمجھ کر سننے لگا۔ کیا بتاؤں اُس کی بھاری آواز میں کتنا درد اور کتنی گھلاوٹ تھی۔ طبیعت پر نشہ سا چھا گیا۔ سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علیگڈھ اور بریلی کے درمیان یہ شخص وقتاً فوقتاً گاتا رہا۔ اور اُس کے گانے کی وجہ سے سفر خاصا دلچسپ رہا لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں میں نے اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب کوئی سات آٹھ آدمی، مکان کے سامنے چبوترے پر مونڈھے اور کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب جو اپنی وضع قطع سے ایک قلندرانہ شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تشریف لائے۔ گٹھا ہوا جسم، گھنی سیاہ ڈاڑھی، آنکھوں میں سُرمہ کالا تہمد اور گہرے کتھئی رنگ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا ——— وہ یقیناً کوئی صوفی تھے۔ آتے ہی بڑے ابّا سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔ میں اُن کی آواز سن کر اُچھل پڑا۔ میں نے کہا "حضرت میرا خیال ہے آپ تین چار دن ہوئے بریلی تشریف لائے تھے۔" کہنے لگے، "جی ہاں آپ کو

کیسے معلوم؟ آپ بھی شاید اُسی گاڑی سے آئے ہوں گے"۔ میں نے کہا "آیا تو میں بھی اُسی گاڑی سے تھا، لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں"۔ "پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اُس گاڑی سے بریلی آیا؟" اُنھوں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ غرض کہ اُن کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی، اور آخر میں جب میں نے اُنھیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت متحیر ہوئے۔ اُس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے اُن کا گانا بھی سنا۔

تو بتن میاں! بات یہ ہے کہ میں آدمی کو اُس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں۔" کوہ نور" میں بھی یہی ہوا۔ جونہی وہ صاحب بولے، میں اُن کو پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر نصیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہ چکے تھے۔ اُنھوں نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے۔ فوراً بولے، "آپ دہلی سے تشریف لائے ہیں؟" میں نے کہا، "جی ہاں، معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب! میں نے اب تک آپ کو پہچانا نہیں تھا"۔ بولے، "ہاں، میں بھی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا"۔ پھر میں نے کہا "بہت کافی تبدیلی ہو گئی آپ میں دو تین مہینے کے اندر" اُنھوں نے لندن پہنچ کر نہ صرف داڑھی منڈوا دی تھی بلکہ مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں، اور میرا اشارہ اسی تبدیلی کی طرف تھا۔ وہ ہنسنے لگے۔ "اور آپ پہلے کی نسبت کچھ دُبلے بھی معلوم ہوتے ہیں"۔ میں نے اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے "جی ہاں، میری صحت یہاں آکر کچھ اچھی نہیں رہی۔ شروع میں دو تین مہینے تو "ہوم سِک" رہا اور اب اکثر قبض کی شکایت

رہنے لگی ہے ...... "ہوم سِک!" سُنتے ہو بتن میاں! ڈاکٹر نصیر لندن پہنچ کر "ہوم سِک" ہو گئے! اور دو تین مہینے تک "ہوم سِک" رہے، اس قدر "ہوم سِک" کہ اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑا اور صورت پہچاننی مشکل ہو گئی!

مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص! اپنے گھر سے دور پردیس میں جا کر رہے گا تو وہ پردیس خواہ باغِ ارم ہو خواہ ویرانہ، اُس کا "ہوم سِک" ہو جانا تقریباً لازمی ہے۔ جو لوگ تعلیم کے لیے یا کسی اور غرض سے یورپ جاتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اس دماغی بیماری میں کم از کم کچھ دنوں کے لئے ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ یورپ کے وہ مقامات جہاں یہ لوگ جا کر ٹھیرتے ہیں رونق، چہل پہل اور گھما گھمی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ بیماری عام طور پر دو ڈھائی مہینے رہتی ہے، اُس کے بعد ختم ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص جلد سے جلد اس کے اثر سے نجات پانا چاہے تو اُس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کرے اور کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لینا شروع کر دے۔ مصروفیت اور دلچسپی! مصروفیت اور دلچسپی! مصروفیت اور دلچسپی! یہی دو چیزیں ہیں جو تمھاری بددلی کا علاج کر سکتی ہیں اور تمھاری بدمزگی کو دور کر سکتی ہیں۔ اور اسی بنا پر میں نے تمھیں لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔

یوں بھی مطالعہ ایک اچھی اور ضروری چیز ہے اگر تم مطالعے کو اپنے مشاغل کا ایک اہم جزو نہ بناؤ گے تو کیا دیس کیا پردیس، ہر جگہ تمھاری زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ ہُوحق کرنے میں انسان —— ایک معقول

انسان !ــــــ اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک وقت آتا ہے جب وہ اس روش سے اُکتا جاتا اور اُس کے فضول اور لغو ہونے کا قائل ہو جاتا ہے۔ لو، ایک قصّہ سنو!

اصل میں یہ کوئی قصہ نہیں ہے، بلکہ میں ایک مشہور مصنف کا قصہ دہرانا چاہتا ہوں۔ سامرسٹ ماہم کا نام بھلا تم نے کاہے کو سنا ہوگا۔ وہ انگریزی زبان کا ایک بلند پایہ ڈرامہ نگار افسانہ نویس ہے۔ اُس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ صرف وہی لوگ بے دلی، افسردگی، اُکتاہٹ کا شکار ہوتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں، اور صرف گاؤدی قسم کے لوگ ہی اپنا دل بہلانے کے لیے خارجی دنیا کے محتاج ہوتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ دنیا میں بکثرت لوگ ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی علمی افلاس اور ذہنی بے مائگی میں مبتلا ہیں۔ وہ حصول مسرت کے ذرائع ہمیشہ خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں، اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اُن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اُن کی زندگی کے دن، مہینے اور سال گزرتے چلے جاتے ہیں، لیکن کبھی اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولیں، روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیں اور اندرونی کیفیات کا تجزیہ کریں۔ میرے نزدیک ایسے لوگوں کی زندگی گدھوں کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

اِس لیے میرا مشورہ ہے بنّن میاں! کہ تم اس بات کا بالکل خیال نہ کرو کہ بھاموا ایک ویران پسماندہ، اور غیر مہذب مقام ہے۔ اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو، اور کتابوں میں دل لگاؤ۔ تمھارے خالی لمحات کو

پُر کرنے کے لیے مطالعہ بہترین چیز ثابت ہوگا۔ اور ہاں ایک بات اور ذہن
میں آئی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے ویران، پس ماندہ اور غیر مہذب مقامات
اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتے؟ کیا بھا ہو میں انسانی زندگی اور انسانی
معاشرت نہیں ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکے؟ کیا وہاں صبح و شام کے مناظر
بہتے ہوئے دریا، کھلے ہوئے میدان اور گھنے جنگل نہیں ہیں جن میں قدرت کی
جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کیا جا سکے؟ مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ سب کچھ ہے
اور کسی ذی ہوش انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہاں رہ کر ان چیزوں کی طرف
سے آنکھیں بند کرے اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر دہلی، لکھنؤ
اور لاہور کی ہنگامہ پرور صحبتوں کی یاد میں ٹھنڈی آہیں بھرے اور
اپنی محرومی پر آنسو بہائے۔ میں اس عقیدے کا انسان ہوں بتن میاں! کہ
آدمی اگر قطب شمالی پر بھی جا کر رہے تو اُس کے پاس بیکار اور بے کار رہنے کی
کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گزار سکتا ہے۔
یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ اُن کو گھر سے
باہر نکلنے اور دنیا دیکھنے کا موقع ملے۔ پھر لائق افسوس ہیں وہ لوگ جس کو ایسا
موقع ملتا ہے اور وہ اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ مجھے بھی قدرت نے ایک
مرتبہ ایسا ہی بیش بہا موقع عطا کیا تھا۔ لیکن میں اُس سے مستفید نہیں ہوا کیونکہ
میں اُس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے
اور محسوس کرنے کی جو تڑپ آج میرے اندر ہے وہ اُس وقت نہ تھی۔ حیاتِ
انسانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے چاروں طرف پھیلا پڑا رہا، لیکن میں نے

اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور آج یہ حالت ہے کہ گویا زندگی کے خشک ریتلے ساحل پر ماہیٔ بے آب کی طرح پڑا تڑپتا ہوں۔ افسوس! افسوس! افسوس! مگراب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل؟ خدا سے دعا ہے۔ ننّن میاں! کہ تمھیں اس طرح کبھی نہ پچھتانا پڑے!

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ سیاحت و سفر کا ایک بہت بڑا فائدہ یاد آیا۔ جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ گھر سے نکل کر پردیس میں رہیں اور مختلف مقامات دیکھیں اُن میں ایک خود اعتمادی اور ذہن و کردار کی ایک پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ خوبیاں اُن لوگوں میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں جن کو سیر و سیاحت کے مواقع میسر نہیں آتے۔ لو، ایک قصّہ سنو!

ابھی پچھلے دنوں ناصر بھائی نے اپنے ایک عزیز دوست سلمانی صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو مع ہمارے چند دوسرے احباب کے ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیروانیاں اُتار کر بہت دیر تک اُن کے خانہ باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا، "کیوں نہ ہم لوگ ذرا ٹہلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹلے تک ہو آئیں؟" سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور مسز سلمانی نے بھی اجازت دے دی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کا کوٹلہ دور کتنا ہے! چنانچہ ہم سب جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح

چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن سلمانی صاحب نے کہا، "ذرا ٹھہرئے میں ابھی آتا ہوں" اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ میں سمجھا کپڑے پہننے گئے ہیں۔ مگر ناصر بھائی اور مسز سلمانی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے "جانتے ہو یہ کہاں گئے ہیں؟" میں نے کہا "میں تو نہیں جانتا۔" "اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں،" ناصر بھائی نے کہا۔ "اجازت! کس بات کی اجازت؟" میں نے پوچھا۔ "اجازت اس بات کی فیروز شاہ کے کوٹلے تک ٹہل آئیں،" ناصر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ مسز سلمانی بھی ہنسنے لگیں۔ میں اس مذاق کو خاک نہیں سمجھا۔ بیوقوفوں کی طرح ان دونوں کا منھ تکنے لگا۔ بالآخر ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلمانی صاحب آج تک اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کہ اُن کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی ہے کبھی دو چار دفعہ سے زیادہ دہلی سے باہر نہیں گئے، اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ کچھ سمجھے بنّن میاں! ہر چند کہ سلمانی صاحب کی یہ عادت کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنی والدہ کی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں کوئی بری عادت نہیں ہے، مگر پھر بھی میں اس کو اُن کے کردار کی بہت بڑی کمزوری خیال کرتا ہوں۔ میں ابھی اُن سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا ہوں۔ اگر

اِن ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً اُن کی اِس کمزوری کا اور اُن کی زندگی پر اِس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی، یعنی کسی تفصیلی مطالعے کے بغیر، اتنی بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سمانی صاحب خود اعتمادی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لیے نہیں، بلکہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لیے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے۔ اور والدہ کی اجازت کے علاوہ بیوی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچّوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں۔ اور کچھ عجب نہیں جو نوکروں سے بھی صلاح کر لیتے ہوں۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے!

اور ان کی اِس خوفناک کمزوری کا سبب ہے یہی کہ وہ کبھی کسی قابلِ ذکر مدت کے لیے گھر سے باہر نہیں رہے، اُنھوں نے کبھی کوئی لمبا دور دراز کا سفر نہیں کیا، اور اُن کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور غم خواروں سے دور ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اُس کا نتیجہ بُرا یا بھلا مجھی کو بھگتنا پڑے گا۔

اب تم خود سوچ لو بتّن میاں! کہ قدرت نے تمھیں برما کے سفر پر مجبور کر کے تمھارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا بُرا۔ اور یہ کہ بھامو میں تمھارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم ہندوستان واپس آنے کے لیے بے قرار ہو۔ پوچھیے کیوں تو جواب ملتا ہے کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی اُمید نہیں، اور اگر مل بھی سکتی ہے تو

برسوں کے انتظار اور مدتوں کی امیدواری کے بعد! ماموں جان کے خطوط سے تمھارے اِن خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ برابر یہی لکھ رہے ہیں کہ بتن میاں کے لیے کوشش ہو رہی ہے اور خدا نے چاہا تو جلد کامیابی ہوگی۔ ماموں جان کا خدا بھی وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو؛ اِس لیے میں بھی اُن کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمھیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے میں تمھاری بات مانے لیتا ہوں اور یہ فرض کئے لیتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہے، یعنی یہ کہ بھاسو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اِس کے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمھیں بھاسو میں رہنا چاہیئے، کیونکہ ہندوستان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم ابھی تلاشِ معاش کے مصائب سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہو۔ دنیا میں لاتعداد نوجوان ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد بلکہ فوراً کوئی ملازمت نہ ملی تو بھوک اور فاقے سے مفر نہ ہوگا۔ جستجو اور تلاش تو اُسی کی ہے جو اِس ہولناک احساس کے ساتھ اور اِس بھیانک خوف کو دل میں لے کر نوکری ڈھونڈے کہ اگر کل تک مجھے نوکری نہ ملی تو میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

تو، ایک قصّہ سنو!

معین الدین میرا ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم پنڈت کے کوچے میں رہتے تھے وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی

عربک سکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی۔ چنانچہ وہ اکثر ابّا جان مرحوم سے انگریزی پڑھنے ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ تم اُس کو نہیں جانتے کیونکہ تمھارے ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علیگڈھ جا چکا تھا۔ اُس نے پانچ چھ برس میں علیگڈھ سے بی۔ اے کیا۔ اُس کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ جب نتیجہ شائع ہوا تو اُس کا نام چوتھے نمبر پر تھا۔ اُس سال چار آدمی لیے جانے والے تھے۔ بس پھر کیا تھا معین صاحب کے ٹھاٹھ ہو گئے۔ فیسیں معاف کرا کرا کے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن بی۔ اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انگلستان سے واپس آ چکا تھا اور گھر میں پڑے پڑے "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" کا ورد کیا کرتا تھا۔ یہ گویا نشے کے اُتار کی حالت تھی، اور طبیعت کی بے کیفی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ معین کی کامیابی کی خبر سنی تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اُس کو مبارکباد تو دے آتا۔ لیکن جی نہ چاہا۔ معلوم نہیں یہ رشک و حسد کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو میں اُس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! ابھی یہ خبر تازہ ہی تھی کہ یکایک دوسری خبر ملی۔ وہ یہ کہ معین صاحب ڈپٹی کلکٹری میں نہیں لیے گئے۔ ارے بھئی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ پتہ لگا کہ فرقہ وارانہ تناسب کو قائم رکھنے کے لیے ایک عیسائی امیدوار کو لے لیا گیا جو بیسویں نمبر پر تھا، اور معین صاحب کو رد کر دیا گیا۔ یہ لیجئے بنا بنایا محل گر پڑا۔

وہ پہلی خبر سُن کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن یہ دوسری خبر سن کر یقیناً رنج ہوا۔ خیر۔ اُس کے بعد بہت دنوں تک میں معین کے حالات سے بے خبر رہا۔ بس اِتنا معلوم ہو سکا کہ وہ نائب تحصیلداری، اکسائز انسپکٹری اور اِس قسم کی دوسری چیزوں کے لیے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہوا مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کانپور میں رہ کر دہلی واپس آیا تو ایک دن سرِ راہ اُس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اُن دنوں ڈی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ٹی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں چالیس روپے کی کلرکی اور وہ بھی عارضی! خیر، اب پچھلے ہفتے ایک مدت کے بعد اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔ آج کل اجمیری دروازے سے باہر ایک عظیم الشان نمائش ہو رہی ہے اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ میں کسی شام ٹہلنے نکلتا ہوں تو اکثر و بیشتر قدم خود بخود اُسی طرف کو اُٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے میں ایک ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک میری نظر معین پر پڑی جو ریستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر مالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "کمال کرتا ہے یہ شخص بھی!" میں نے اپنے دل میں کہا، "اب کلرکی کرتے کرتے ریستوران کھول بیٹھا۔" چائے ختم کر کے میں سیدھا اُس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑا اور بوکھلا سا گیا۔ "کہو بھئی معین!" میں نے کہا، "کیا حال چال ہیں؟ یہ ریستوران کب کھولا؟"
میرا سوال یکسر مہمل تھا، کیونکہ میں نے اُس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ

صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ ملازم تھا، اور صبح سے
شام تک وہاں بیٹھ کر بل بنانے کی خدمت اُس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے
میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور مجھے اس کی حالت پر بہت زیادہ رحم آیا۔
لیکن میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اپنے قدرتی
انداز میں اطمینان کے ساتھ باتیں کرتا رہا، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے نزدیک اُس کا
ریستوراں میں ملازم ہونا کوئی افسوس ناک اور رحم انگیز بات نہیں ہے۔ میں
نہیں چاہتا تھا کہ جو خفت اس اچانک ملاقات سے اُس کو ہوئی ہے، اس
میں مزید اضافہ کروں۔ مگر اُس نے خود ہی اپنے روزگار کے متعلق گفتگو شروع
کر دی۔ اُس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سن کر میرا تو دل ہل گیا۔ تقدیر کا
کھیل دیکھئے کہ وہ شخص جو شاید ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہوتا برسوں سے
اس کوشش میں ہے کہ دو وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں
ہوتی۔ اُس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اُسے اس بات کا بالکل
غم نہیں ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوراں میں
دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ پندرہ بیس دن بعد
جب نمائش ختم ہو جائے گی اور ریستوراں نہ رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا
کہاں سے آئے گا! عبرت! عبرت! عبرت!

بنن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاشِ معاش کی تلخی سے دو چار ہی
نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے! تمھارے روزگار کا
مسئلہ کوئی بہت نازک اور پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی

ضروریات یعنی کھانا کپڑا وغیرہ حسبِ دلخواہ پوری ہوتی رہتی ہیں، اور آئندہ بھی اُن کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے۔ چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں اس آرام اور عافیت کی قدر کرنی چاہیے۔ بربا گئے ہو تو اب وہاں ،، کر کچھ کام بھی کرو۔ اگر اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقبل ملازمت ملنے کی اُمید بالکل نہ ہو۔ معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کرو۔ کچھ نہیں تجربہ ہی حاصل ہو گا، دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہو گی معلومات میں اضافہ ہو گا، قابلیت بڑھے گی اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ سرٹیفکٹ ہی لے لو گے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمھیں اُس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اور جناب نے یہ کیا فرمایا کہ ہندوستان کو جنگ آزادی کے لیے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیکار پڑا سڑ رہا ہوں؟ واہ واہ وا! کیا کہنے ہیں مّن میاں تمھارے! قربان جایئے اس بلند خیالی کے! مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈال لی ہوتی۔ باوا مر چکے گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی، بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل ہیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف گاندھی اور جواہر لال ہی منھ سے

نکلتی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگِ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے ببّن میاں! اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں دولت سب سے اہم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تو، ایک قصہ سنو!

ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا اُس کے سیاسی خیالات کچھ تمھارے ہی جیسے تھے۔ لیکن تم نے تو (معاف کرنا ببّن میاں!) دو چار باتیں اِدھر اُدھر سے سُن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کثرت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اُس کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتدا میں اُس کو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اُس سے قریب تر کر دیا تھا۔ لیکن اُس کا شوق جلد ہی ختم ہو گیا، کیونکہ سیاسیات سے اُس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔ اے میں اُس نے فارسی نہیں لی، بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لے کر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہو گیا —— جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا اب اُس کو حقارت کے ساتھ "مڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا۔ یہی نہیں، اور بھی بہت سی چیزیں اب اُس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی

ہوئی تھیں، مثلاً مذہب، مروجہ اخلاق، معاشری رسوم، مختلف سیاسی ادارے، فنونِ لطیفہ کے شاہکار۔ اور ان سب کو وہ قابلِ نفرت خیال کرتا۔ پرائیویٹ پراپرٹی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، غلامی، غریبی، جہالت، ہر چیز اس کے نزدیک "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار تھی۔ فرانسیسی مفکر و مدبر پرودھن کا مشہور جملہ "پراپرٹی اِز تھفٹ" (ملکیت سرقہ ہے) ہر وقت اس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا "میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔" کہنے لگا "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔" میں نے کہا "تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔"

"تو گویا وہ تمھارے نزدیک ایک لائقِ تحسین چیز ہے؟" اس نے سوال کیا۔ میں نے کہا "بے شک! وہ فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائقِ صد تحسین ہے۔" "مگر میں اس کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا "ضرور سمجھو" میں نے جواب دیا۔ "آج کل اچھی چیزوں کو برا کہنا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک نہایت معمولی درجے کا شاعر تھا۔" اس نے میری بات کو غور سے نہیں سنا اور اپنی کہے گیا "میں تاج محل کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں وہ اس

زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹتے تھے اور اُن کے خون سے اپنی محفلوں کو رنگیں بناتے تھے......" "تمھارا خیال صحیح ہے" میں بیچ میں بول اٹھا "لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو بھگوان داس! تم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمھارے اندر بڑا عیب ہے۔" اُس نے جواب دیا "تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو "اِم مورل" تھا ——— بنیادوں سے لے کر چوٹی تک "اِم مورل"! اس لیے تاج محل بھی ایک "اِم مورل" چیز ہے۔" میں نے کہا "اگر "اِم مورل" ہے تو ہوا کرے۔ خوبصورت تو ہے۔ اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "اِم مورل" ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی ہے، اور اس کا "اِم مورل" ہونا اُس کے حسین ہونے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔" اس پر وہ طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا، کہنے لگا: "طوائف "اِم مورل"! کتنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے......" میرے نزدیک اُس کی گفتگو ہمیشہ ایک

ہزلیہ نظم ہوتی تھی اور "پرائیویٹ پراپرٹی" ٹیپ کا بند۔ جب وہ اِس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ لیکن اُس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا: "طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے! شادی کی رسم بھی "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے، اور پردے کا رواج بھی "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے......" میں نے کہا،

"بھگوان داس! آج تمھارا بخار بہت تیز ہے۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹ کر آرام کرو۔" وہ اٹھا اور مجھے جاہل، کوڑھ مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اُس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات پر "پراپرٹی از تھفٹ" کی مُہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکایک اُس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکزِ ثقل سے اس حد تک ہٹے کہ اُنھوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا "بھگوان داس! اب تک جو بکواس تم وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہو، اُس کو میں نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آئے گی، نہ یہ مواقع جو آج تمھیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔" اس پر بولا "مجھے بی۔ اے یا ایم۔ اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں۔" میں نے کہا "چلو یونہی سہی۔ تمھیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مگر تحصیلِ علم بذات خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔" "علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے" اس نے کہا، "بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔" "سبحان اللہ! کیا زرین خیالات ہیں!" میں نے کہا، "تمھارے دماغ میں خناس سما گیا ہے بھگوان داس! اور کوئی بات

نہیں ہے۔" لیکن اُس نے کبھی میرے غصے کی پروا کی تھی نہ طنز و ملامت کی۔ چنانچہ حسب معمول اپنی کہے گیا۔" کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لیے ہے، نہ کہ اُن لوگوں کے لیے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گزر چکا ہے، اور اِس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اُس نے کالج سے نام کٹایا اور بمبئی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ماں کو لکھ دیا کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کر کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی دیہاتی عورت۔ وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اُس کی قدر کرتی۔ اُسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ ضلع رہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا تصور یہی دو چیزیں اُس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اب جو بیٹے کے خوفناک ارادے کی خبر پائی تو بلبلا اٹھی۔ خط پر خط لکھنے شروع کیے۔ بھگوان داس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں، اپنے غصے کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا۔ مگر اُس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اُس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا: والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک عیاشانہ پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے، اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو

ایک قطعی غیراہم چیز سمجھتا ہوں۔" آخر میں تنگ آکر ماں نے لکھ بھیجا "اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی۔" مگر یہ حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ اُن پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ اُنھوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروانہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اِس بات کو مُشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لیے چلے آرہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں، اور جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیص ہے اور ایک میلا کچیلا نکر! "آئیے تشریف لائیے!" میں نے کہا "آپ کا نام بھگوان داس ہے نا؟" مگر وہ کسی چہل کے لیے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی پر گر پڑا اور بولا "میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ۔"

ناشتے کے بعد جب میں اُس کی داستان سُننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا ہی نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس کے آدمی بھی لایا ہے میں نے دل میں کہا "یہ کم بخت کہیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے ایسے خطرناک آدمی سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ دوستی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم میٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں۔ اور بے گناہ مارے جائیں" میں نے جلد سے جلد اُس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور تیسرے دن ٹکٹ دلوا کر رہتک روانہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوان داس پر بمبئی میں کیا بیتی
اور وہ کیوں وہاں سے اِس قدر جلد واپس آگیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے
جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو بنّن میاں! میرا یہ خط خط نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا
خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی
پہنچ کر بھگوان داس کو ایسی ذہنی جسمانی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا جو اُس کے لیے
بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک نازوں کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی
کے مصائب! ماں نے انتہائی خوشامد کے باوجود روپیہ نہیں بھیجا۔ اور اس سے
اُن مصائب میں چندور چند اضافہ ہو گیا۔ غرض کہ "دنیا کے عوام کی محبت" نے
اچھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بھگوان داس جی کو ایسے سخت جھٹکے دیئے کہ دن میں
تارے نظر آنے لگے"۔ "آزادی اور انصاف کی حکومت" قائم کرنے کا خیال ترک
کر دیا۔ ماں کو لکھا "روپیہ بھیجو، ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے"۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا بنّن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہو گئیں۔ یہ تو
اُس کی بربادی کی محض ابتدا تھی۔ تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد
جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لیے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار
کر دیا۔ غریب نے بہتیرا سر پٹکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں
جس کالج میں بھی گیا یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایر میں داخل کریں گے۔ اُس نے فورتھ ایر
سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ فورتھ ایر ہی میں داخلہ مل جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی، اِن نامساعد حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی مگر ایسے شخص کے لیے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا ملازمت بھلا کون دیتا! دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اُس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل طور پر اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "مڈل کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعے سے جو وقت بچتا ہے وہ خطوط لکھنے اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

اُن کا وہ پرائیویٹ پراپرٹی والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کے اڑ گیا۔ اب ان کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے میں ان کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں اس سلسلے میں اُن کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل وصول ہوا تھا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں :- "میں تم سے ایک بات سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں۔ کیا زندگی کا مقصد حصولِ مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کیے۔ عزت بھی ملی اور ناموری بھی

ہوئی۔ ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کی نام کی مالا جپیں
یا آپ کو غیر فانی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسمے نصب کریں
آپ کو کسی بات سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ کو تو چپکے سے کون جانے کہاں چل دیئے
مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتائیے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جدوجہد،
تگ و دو اور جاں فشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے۔
اور وہ ہے مینائے حیات کا بادۂ عشرت سے سرشار ہونا، یعنی دل کھول کر پیٹ
بھر کے پوری طرح ڈوب کر زندگی گزارنا۔ لیکن یہ معموریت، جسم یا ذہن کو اذیت اور
کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے؟ کسی شاہد رعنا کے آغوش میں
کیا یہ چیز میسر نہیں آسکتی؟ میں شعرا میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب
مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانہ فرزانہ تھا......
میں اپنے چاروں طرف گلعذار بچے، زہرہ جبیں لڑکیاں، اور حسین و رعنا لڑکوں کو دیکھتا
ہوں۔ کل یہ نازک پھول کملا جائیں گے۔ یہ دوشیزائیں پوپلے منھ والی گھوسٹ
بوڑھیاں بن جائیں گی۔ میرا ایک عزیز ہے۔ کیسا بانکا اور سجیلا جوان تھا وہ بھی!
آج دق میں مبتلا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اس کی شہ رگ
کے قریب آپہنچا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت! حسن کا ضیاع، مسرت کا اختصار
—— یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علت غائی آج تک کسی کی سمجھ میں
نہ آسکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ بردوش ہے! میں شوپنہارؔ کو
زندگی کا سب سے عمیق مبصر خیال کرتا ہوں..... فکرِ فردا اور غمِ دوش سے کچھ
حاصل نہیں۔ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ

جان دے دو! اس اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحاتِ گراں کو بد ذوقی اور بد توفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا...... دنیا کے غریب! لیکن آپ کو ان سے کیا؟ ہمدردی! آپ کو اُن سے ہمدردی ہے! خوب! مگر ان کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھنا ہوا مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت کا دوسرا نام ہے! اخلاق! اچھا یہ اخلاق اور اس کی ذریات کا تقاضا ہے؟ ہوگا! مگر میں اس فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں کس قدر پوچ اور سوقیانہ تخیل ہے!......"

تم نے دیکھا بنّے میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو "اِم مورل" کہا کرتا تھا اور دنیا کی ہر اچھی بری چیز کو سرمایہ داروں کی عیاشی کہہ کر قابلِ نفرت ٹھہراتا تھا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے متعلق بہت سے نظریے ہو سکتے ہیں، اور ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کے لیے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریے کا ہو جائے اور تا زیست اسی کا ہو کر رہے۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اس کی خاطر اپنے مستقبل بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بھگوان داس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں اقتصادی خوش حالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگِ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے جس دن بھی ذرا سی بے عنوانی کا اظہار تمھاری طرف سے ہوگا،

اسی من جیل میں ٹھونس دئے جاؤ گے۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر ہوتا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ گاندھی اور جواہر لال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لو ایک قصّہ سُنو!

کان پور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن اُن کا لڑکا نہایت پاجی تھا مطیع اللہ نام، مگر اطاعت سے کوسوں دور! انتہائی کوششوں کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھا لکھا نہیں باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا، اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اُس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی اسکول کے امتحان میں پاس ہی نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہوگئی تو مجبوراً تعلیم بند کرادی گئی۔ اب اُسے لیڈری کا شوق چرایا۔ معلوم نہیں اُس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آگئے۔ غرض کہ قومی و ملکی کاموں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کے مِل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاء اللہ اُن لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے سچے وعدوں اور اشتعال انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں اور اُن کو غلط راستے پر ڈال کر اُن کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث

بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مع اپنے تمام ساتھیوں کے دھر لیے گئے۔ پولیس نے
بے تامل ہتکڑیاں ڈال دیں۔ اُنھوں نے بہت ہیچر میچر کی مگر وہاں بھلا کون سنتا تھا
چاروناچار سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔
لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اُس نے پولیس افسر کو اپنی
خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اُس کی خواہش اور ارادے کو
کمزور سمجھ کر کچھ اہمیت نہ دی، اور ڈانٹ کر کہا، "ابھی نہیں بیٹھے رہو!" چند منٹ
مطیع اللہ نے صبر کیا۔ مگر خواہش نہایت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔
اِس لیے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جا سکا۔ اُس نے پھر پولیس افسر کو یاد دہانی کرائی
وہ کم بخت نہایت ہی شقی القلب تھا۔ پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور
صبر کیا۔ لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہو گئی
کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا نا ممکن معلوم ہوا۔ اُس نے تنگ
آکر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس
جگہ رُکی وہ ایک غیر آباد سا مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات
تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ
لاری سے اُتر کر ایک پولیس مین کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا
جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا، "ہتکڑی کھولو
—— جلدی!" "ہتکڑی تو میں نہیں کھول سکتا" پولیس مین نے کہا، "تمھارے
پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں" - - - -

میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ بنّن میاں کا ساتواں خط ملا:۔

"ہندوستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔۔۔۔۔"

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ بنّن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو دان طبقے کو اپنا مخاطب بنا کر کہوں:۔

لو، ایک قصّہ سنو!

راجندر سنگھ بیدی

رنڈوا

نفسیاتی حقائق کو کامیاب افسانوں کی صورت میں پیش کرنا راجندر سنگھ بیدی

کا کام ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل فن کار ہے، اور۔ اگر اُس کی زبان میں مزید سلیقہ

پیدا ہو جائے، تو اس کی کہانیاں فن افسانہ کی کامیاب ترین مثالیں قرار

دی جا سکتی ہیں، کہ وہ مشاہدہ کا بادشاہ ہے، جزیات اُس کے آرٹ کی جان ہیں،

اور محاکاتی نقطہ نظر سے اُس کی ایک مخصوص اور منفرد حیثیت ہے، اردو افسانہ

کو فرانس اور روس کے افسانوں کا مد مقابل بنانے میں جن نوجوانوں کا حصہ

ہیں، ان میں بیدی ایک ممتاز مقام کا مالک ہے۔

رنڈوا میں اُس نے ایک نفسیاتی حقیقت کو بے حد خوبی اور سلیقے سے افسانے کا

رنگ دیا ہم افسانہ شروع کرتے ہی اس مٹیالے ماحول میں کھو جاتے ہیں، جس میں

رنڈوا بھٹکتا پھر رہا ہے، بیوی کی موت کے صرف چھ روز بعد اگر رنڈوا امرتسر میں

"گل بکاؤلی" کا کھیل دیکھ لیتا ہے، اور اپنے نالائق بیٹے کے باعث بدنام

ہو جاتا ہے، تو سماج بھنا جاتی ہے، قاری کو رنڈوے سے ہمدردی پیدا

ہو جاتی ہے، لیکن بیدی کو نہ سماج سے واسطہ ہے اور نہ قاری سے کہ وہ

ایک کردار کا نہایت مکمل تجزیہ اور مطالعہ کرتا اسی ماحول میں غائب ہو جاتا ہے

اور ہمیں یہ کہتا چھوڑ جاتا ہے۔ "یونہی ہوتا ہے۔ واللہ یونہی ہوتا ہے!" ——

یہ افسانہ بیدی کے فن کی اس لحاظ سے کامیاب ترین مثال ہے، کہ ایک

فروعی باطنی حقیقت کا اس سے زیادہ کامیاب تجزیہ اردو افسانہ میں ہمیں اور

کہیں نہیں مل سکتا۔

اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ رنڈوا تھا۔ اُس نے اِس بلائے ناگہانی سے بچنے کے لئے جدوجہد کی بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ دن کو چلچلاتی دھوپ میں مارا مارا ہسپتال کے ٹی بی وارڈ سے لے کر سواد شہر میں اپنے گھر تک سینکڑوں مرتبہ آیا اور گیا حتیٰ کہ راستہ بھر کے کنکروں کی جائے وقوع اسے حفظ ہو گئی۔ لیکن اتنی ان تھک کوششوں کے باوجود وہ رنڈوا ہو گیا۔ اس بات کا، اس الزام کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا ——— رنڈوا ہو گیا' ہونا جو تھا۔ کیونکہ کسی اور بات سے محلے کے لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ سب یہی کہتے تھے۔ تم نے اس کے لیے کوشش بھی تو نہیں کی۔ اگر تم نے ذرا بھی تندہی سے کام لیا ہوتا تو وہ یقیناً بچ جاتی۔

اپنی تندہی کو یا تو وہ خود جانتا تھا یا ڈاکٹر پال جس کے مکان کا اُس نے دن میں کئی کئی مرتبہ طواف کیا اور جو ایک دائمی بیمار اور چھائیوں اور مہاسوں والی عورت کے مستقبل کے رنڈوے کے لگاؤ کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتا اور کہتا ——— اُسے مرنے کیوں نہیں دیتا، سالا ..... اور جب لوگ رنڈوے پر بیوی کی جانب سے بے پروائی اور بے وفائی کا الزام لگاتے تو وہ چاہتا کہ وہ شہر کے سب سے مشہور کرسٹان ڈاکٹر پال کا نام بطور گواہ کے پیش کر دے .... لیکن ڈاکٹر پال ایم ڈی ایک مصروف آدمی تھا اُسے کہاں فرصت تھی کہ اپنے مطب سے وقت نکال کر عدالت عوام کے کٹھرے میں محض اس بات کی گواہی دینے کے لیے آتا کہ رنڈوا دراصل

بہت باوفا خاوند رہا ہے۔

اور اب رنڈوے نے بابو محلہ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن شادی شدہ لوگوں کے اس محلے میں کسی نے اُسے مکان دینا گوارا نہ کیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم رنڈوے ہو۔ رنڈووں کا کیا اعتبار!

وہ آسانی سے محلّے میں رہ سکتا تھا۔ جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیس اکیس برس سے رہتا آیا تھا اور جہاں اس کی بیوی نے تمام عورتوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مراسم پیدا کئے۔ اور جہاں کی تمام عورتیں اُس کی خوش خلقی اور نیک سیرت کی دلدادہ تھیں۔ لیکن یہی بات تو اس کے لیے وبال جان ہوگئی۔ اگر اُس کی بیوی ایک خوش خلق اور خندہ پیشانی والی عورت نہ ہوتی تو محلے بھر کی عورتیں کہتیں۔ اچھا ہوا جو وہ مرگئی۔ محلے کی عورتوں سے بات بات پر جھگڑا کرتی تھی اپنے مرد کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن اب مرنے والی کے حسن سلوک کی وجہ ہی سے لوگ رنڈوے کو مطعون کرتے تھے کہ اُس نے بیمار بیوی کی حسب دلخواہ پروا نہیں کی۔

حقیقت یہ تھی کہ اُسے مرنے والی سے محبت تھی۔ عام خاوندوں کی طرح وہ بھی رویا تھا۔ لیکن کچھ دیر رونے کے بعد وہ یکایک چپ ہوگیا۔ اور بیوی کی موت کا غم اسے کھانے لگا۔ وہ جی بھر کر رو لیتا۔ یا دکھاوے کے طور پر اُس گھاٹ پر سر پٹخ لیتا جس پر مرنے والی سویا کرتی تھی تو نہ صرف اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا بلکہ محلے بھر کی عورتوں کی تسلی بھی ہو جاتی اور مالاں جس کا خاوند ہفتے میں سات راتیں باہر سویا کرتا تھا کہتی —— آہ! رکمن کی ماں۔ اگر میرا خاوند

میرے مرنے پر اس سے آدھا بھی روئے تو میں آج' ابھی اسی وقت زمین سے برابر ہونے کو تیار ہوں .... اور پھر رنڈوا اس صورت میں ساری عمر کے لئے سبکدوش ہو جاتا۔ لیکن بات در حقیقت یہ تھی کہ وہ اس حادثے کو یاد کرنے اور رش کرنے کے درمیان لٹکتا رہا اور ...... زندگی بھر لٹکتا ہی رہا۔

عورتوں کی محلے میں جو نام نہاد "برادری" تھی اس کا خیال تھا کہ رنڈوا اپنی بیوی کی وفات پر صرف اس لیے نہیں رویا کہ وہ مٹکو مہترانی کو جی جان سے چاہتا تھا۔ وہ ہر روز دن نکلنے سے پہلے اور دن چھپنے کے بعد رنڈوے کے مکان پر سے گملا اٹھانے آیا کرتی تھی۔ اور رنڈوا اسے ہر قسم کی غلاظت اٹھانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اول تو مٹکو خود ہی رنڈوے کے ہاں صفائی کا خاص خیال رکھتی تھی اور اپنے خاوند کی پنشن کے متعلق گھنٹوں سوال کیا کرتی۔ اس کا خاوند تین بٹا پانچ پاونیرز سے ریٹائر ہوا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کو بھاوج کے ساتھ ہنسنے کی حد سے تجاوز ہوتے دیکھ کر دریا میں کود مرا تھا۔

شاید معاملہ اس حد تک نہ پہنچتا اگر رنڈوے میں علی الاعلان یہ کہنے کی جرأت ہوتی کہ میں عورتوں کے اس فضول' بے معنی ٹربیونل کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ عورتیں چند دن بک جھک کر چپ ہو جاتیں۔ لیکن اس نے سوچ لیا کہ اس محلے میں رہنا ہے تو اسی کے مطابق رہنا ہے اور میں نے آج تک کسی کو ناراض نہیں کیا تو بیوی کے مر جانے پر کیوں کسی کو ناراض کروں لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے بچاؤ کی کوئی صورت ہو جاتی اگر اس کا بارہ سالہ لڑکا حرامزدگی نہ کرتا۔

بات یوں ہوئی کہ ہندو عقیدے کے مطابق رنڈوے نے چوتھے پر اپنی بیوی کے پھول چنے اور مروجہ طریقے کے مطابق اسے کنکھل —— گنگا مائی کے چرنوں میں بہانے کے لیے لے گیا۔ مرحومہ اپنے پیچھے وہی ایک بارہ سالہ لڑکا اور دو توام بچیاں چھوڑ گئی تھی۔ بچیاں تو کم سنی کے باعث اپنی ماں کی موت کے غم کو سمجھنے سے قاصر تھیں ان کے لیے تو ماں کی موت یہی تھی کہ جہاں انھیں ہر روز صبح اٹھتے ہی ایک دیکھا بھالا چہرہ دکھائی دیا کرتا تھا اب گھورتے اور اپنے آپ رحم کھاتے ہوئے اجنبیوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ لیکن اس صورت میں وہ اپنی ماں کو اس کی حقیقی موت سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی مار چکی تھیں اُن دنوں جبکہ اُن کی ماں ٹی بی وارڈ میں داخل ہونے کے لیے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی اور نگاہ واپسیں اپنے سرمایہ حیات پر ڈالتی ہوئی رخصت ہوئی تھی۔
اب دونوں توام بچیوں کو روتے روتے دھوپ میں چیونٹیوں کے بلوں پر سو جانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان کے کام و دہن کو دہی اور شکر کا چٹخارہ بھول سا گیا تھا جسے مرنے والی صبح اُٹھتے ہی اُن کے لیے تیار رکھا کرتی تھی......
رنڈوے نے ان دونوں چھوکریوں کو محلے کی ایک رحم دل بیوہ کے سپرد کیا" اور بڑے چھوکرے کو لے کر ہردوار روانہ ہوا۔
رنڈوے کے پاس ہردوار جانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ تو کب کے مرنے والی کی بیماری پر ختم ہو چکے تھے۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنی بیوی کی آخری خواہش کہ اُس کی ہڈیاں جو ساری عمر آگ میں بھنکتی رہی ہیں، گنگا کے برفانی پانی میں بہادی جائیں، پوری نہ کر سکا۔ لیکن اس نے سوچا کہ

اگر مرنے والی کے پھول بہانے کے لیے وہ اُودھار لے، ہردوار پہنچ کر کرایہ کے علاوہ وہاں پن میں پانڈوں سے اپنی چمڑی نچوائے اور پھر عمر کا بقیہ حصہ اودھار سے سبکدوش ہونے کے فکر میں گھلتا رہے تو یقیناً مرنے والی کی روح کو صدمہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہردوار جانے کی بجائے چپکے سے مرنے والی کے پھول دریائے بیاس میں بہا دیئے۔

بیاس میں پھول بہانے کے بعد وہ امرت سر پہنچا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک آدھ دن اسی شہر میں گذار دے تاکہ واپسی پر لوگوں کا یہی خیال ہو کہ وہ ہردوار ہو کے آیا ہے۔ چنانچہ وہ اتر کر اپنے بیٹے کے سات امرت سر کے بازاروں میں گھومنے لگا۔ بیس اکیس سال ایک عورت کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد یکایک رنڈوا ہو جانے کو اس کے دماغ نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ اُسے تو یہ بھی نہیں محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ امرت سر کے بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ اُسے ہر گلی اپنے محلے، اپنے گھر کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور معاً اسے خیال ہی آتا تھا کہ گھر پہنچتے ہی اس کی بیوی ہمیشہ کی طرح کہے گی۔ شرتی کے بابو! دیکھا تم نے؟ آج تمھارے لالہ نے مجھے چھنال کہا ہے۔ بانٹو کچھ بتاشے وتاشے۔ بیٹے ہوئے اور ماں کو چھنال کہا۔ ارے گوری میا، بس رکھ لے تو اب میں تو یہی مانگتی ہوں تجھ سے ....

اس وقت وہ سوچا کرتا تھا کہ شرتی کی ماں "تمھارے لالہ" کیوں کہتی ہے گویا وہ لالہ میرا ہے۔ اُس کا کچھ نہیں۔ اور پھر اس کی شکایت میں ایک یہ خواہش کی ایک لہر پوشیدہ ہوتی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اس کا لالہ اپنی پیاری ماں کو

چھنال کہیں!...... عجب عورت تھی۔ اسی انہی باتوں کی وجہ سے رنڈوا بخت
تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا بیٹا ساتھ تھا تاہم اُسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے
دنیا نے یک لخت اُسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ امرت سر کے بازاروں
سے بھاگ جائے اور شمشان کے دروازے پر کھڑا ہو کر اس راستے کو تلاش کرے
جس پر کہ اُس کی بیوی گئی تھی۔ رات کو اُسے کہکشاں میں اس کے پاؤں کے نشان
ملتے۔ اور دن کو سینکڑوں ہزاروں آوازوں میں اس کی آواز میٹھی مترنم آہستہ آہستہ
سنائی دیتی —— شرتی کے بابو...... تمھارے لالہ نے...... شرتی کے
بابو آج تمھاری بٹو چھوٹی ہے کل بڑی ہو جائے گی...... اے جی میں کہتی ہوں
...... اور پھر وہ کہتا "اے رانی! تم نے جھٹ سے دو چھوکریاں جن دی ایں
شیرنی ایک جنے اور وہ بھی...... کیوں رانی...... شرتی کے بابو! —— وہ
ادھر اُدھر دیکھتی اور کہتی —— تم ہی نے دیئے ہیں نا۔ پلے ہیں یا شیر کے بچے۔
اور رنڈوے کو ان تمام آوازوں تمام نظاروں سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
کوئی بڑا سا ہوائی جہاز کسی دلدل والے جنگل میں ٹکرا گیا ہے اور اس کے ٹوٹے
ہوئے ڈھانچے میں سینکڑوں ہزاروں سلاخیں، درختوں کی بے تحاشا ٹہنیوں میں
اُلجھ کر قائمہ، منفرجہ وغیرہ ہر قسم کے زاویے بنا رہی ہیں۔ اور اس ڈھانچے کے
نیچے انجن ابھی دھیما دھیما سلگ رہا ہے یا سب کچھ اُسے اس قسم کا آخری حصہ دکھائی
دیتا جو طوفان کے منظر پر ختم ہو رہی ہو اور اس طوفان میں کوئی نحیف و ناتواں
پکارتا ہوا جا رہا ہو۔ رانی! —— تم کہاں ہو! میرے لاڈے شرتی کی ماں ——
—— رانی،

اس وقت رنڈوا ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ایک سمت کو جا رہا تھا
وہ گزرنا ہی چاہتا تھا کہ اُسے اپنے کانوں میں ایک گھنٹی کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی
وہ گھنٹی کی آواز نہ تو کسی شاعر کے قافلے کی صدائے جرس تھی اور نہ صوفی لوگوں کی وہ بانگ درا جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور جسے سنتے ہوئے انسان مقامِ حق پر پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک عام گھنٹی کی آواز تھی جو سینما والے اپنے اشتہار بانٹتے ہوئے بجاتے ہیں۔ رنڈوا بڑے غور سے اس آواز کو سننے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ شہر کے ایک سینما میں کھیل "گل بکاؤلی" لگا ہوا ہے۔ گل بکاولی دیکھنے کا خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں نمودار ہوا۔ وہ اس دنیا سے جو کہ آناً فاناً اُس کے اردگرد پیدا ہو گئی تھی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس بات کا تو سوال ہی نہ تھا کہ ایسا فعل کرتے ہوئے اسے بیوی سے محبت تھی یا نہیں۔ بلکہ کوئی زخم تھا جس پر مرہم رکھنے کے لیے اُس نے سینما کا رخ کیا اگر کوئی زخم نہ ہوتا غم ہی نہ ہوتا تو شاید گل بکاولی دیکھنے کا خیال اس شدت سے اس کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ وہ سیدھا اپنے راستے پر چلتا جاتا اور شام کے قریب کسی ویشنو بھوجن شالہ میں کھانا کھا کر گورو کی نگری میں دربار صاحب کے کسی بنگے میں پڑ کر چپکے سے رات گزار دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ کیونکہ اس کا دل غم و اندوہ سے تقریباً ہلکان ہو چکا تھا۔
لیکن رنڈوے کا غم گل بکاولی سے زیادہ تھا۔ دس گل بکاولیوں سے زیادہ بیس سے زیادہ۔ تاج الملوک کی ریشہ دوانیوں میں اس کا دل الجھ نہ سکا۔ بکاولی کی حرکتیں اسے محض اس لیئے بری لگیں کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اور

جب تاج الملوک کے باپ کو بصارت ملی۔ تو زنڈوے کو یوں محسوس ہوا جیسے سب دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکا اور سوچنے لگا۔ کیا اُس کا تاج الملوک بھی زندگی میں اس کے لیے بصارت لائے گا۔ اس کے بعد پردۂ سیمیں پر دریا کے بہاؤ کا بہت اچھا منظر آیا۔ لیکن اسکی آنکھیں سب سین سینری سے بے نیاز ہو گئی تھیں۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ اُس کے سر میں سخت درد تھا۔ تین سال پہلے اس نے سنگ جانی کی کانوں میں ایک مزدور کو کوئلے میں بیلچہ مارتے دیکھا تھا۔ وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سر کے کوئلوں میں کوئی زور سے بیلچہ مار رہا ہے اور جب وہ سینما سے باہر نکلا تو مسکرانے لگا اور سوچنے لگا کہ وہ آخر سینما دیکھنے کیوں چلا گیا تھا۔ وہ خود بھی اپنے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے یا ہزار ناسوروں کا نچوڑ جو کہ ہزار آتشہ ہو کر مسکراہٹ بن گیا ہے اور اس بات کا اس کے اپنے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ وہ سینما دیکھنے کے لیے کیوں چلا گیا تھا فقط اسے اتنا محسوس ہوا کہ اُس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ اور یہ خیال وزنی ہوتا ہوا کسی نہ گھلنے والی چیز کی طرح آہستہ آہستہ دل کی تہ میں بیٹھنے لگا۔ سیسے کی قسم کے اس خیال سے بچنے کے لیے زنڈوے نے کوشش کی کہ اگر گل بکاولی میں کوئی اخلاق آموز نکتہ ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے اس قسم کا تجربہ اس نے زندگی میں بہت مرتبہ کیا تھا جب کبھی وہ اپنے آپ کو مصیبت میں گھرا ہوا پاتا تو عموماً ایک مذہبی کتاب کو اٹھا کر کھولا کرتا ——
یونہی کسی صفحے سے اُسے یقین ہوتا تھا کہ اُس پر ضرور کوئی ایسی ہدایت لکھی ہو گی۔

جسے پاکر وہ سیدھے راستے پر چل سکے گا۔ اور وہ تحریر ہمیشہ اُس کے حسب حال ہوا کرتی تھی اور اسے پڑھ کر وہ یک گونہ مطمئن ہو جاتا تھا مثلاً ایک دفعہ جب اس کی کتابوں کی دکان چل گئی تھی اور دوسرے بیوپار کے لیے اس نے اپنے ارادے کو بہت کمزور پایا تھا تو اس نے کتاب کھول کر پڑھی لکھا تھا ــــــ

"جب بار بار عہد کرنے پر بھی ہم اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو یا تو کسی چیز کا قصد ہی نہیں کرتا یا ڈھلمل یقین کے ساتھ اپنے راستے میں بڑھنا چاہتا ہے"۔ اور رنڈوے نے اُسے کتنا حسبِ حال پایا تھا۔ اور اپنی ہر ناکامی کا الزام اپنی غیر مستقل مزاجی پر تھوپ کر مطمئن ہوگیا تھا۔ اس کے دل سے اس تجزیہ نفس کو دیکھ کر ایک ٹیس دور ہو گئی تھی۔ خدا جانے وہ بات حسبِ حال تھی یا نہیں لیکن مذہبی کتابوں میں ہر بات حسب حال ہوتی ہے اور جب کبھی وہ دوراہے پر پہنچ کر رہبری کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا تو وہ اُسے ہمیشہ ٹھیک راستے پر لگاتی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ دکھی رہتا تو اس کے خیال کے مطابق قصور اس کے ایمان کا ہوتا۔

اور اپنی بیوی کی موت کے بعد رنڈوے نے اپنی دو معصوم بچیوں کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ رو نہیں رہی تھیں۔ وہ عورتوں کو اپنے ارد گرد روتے دیکھ کر گھبرا اٹھی تھیں۔ گھر میں سینہ کوٹنے اور باضابطہ بین کی وجہ سے ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ شہر سے آئی ہوئی رشتہ دار عورتیں مریضہ کی چارپائی، مریضہ کے برتن، مریضہ کی تمام ان چیزوں کو جن سے کہ وہ زندگی بھر وابستہ رہی تھی اور جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں اور جو چیزیں

اس نے اپنے مفلوک الحال خاوند کی غربت کے باوجود بنائی تھیں اٹھا کر باہر
پھینک رہی تھیں۔ اس وقت رنڈوے کا دل ڈوب گیا تھا۔ وہ رو نہ سکا،
اس کا غم رونے سے کہیں زیادہ تھا اور ملال کہتی تھی۔ رکمن کی ماں! مردوے کی
آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں، تمام مرد ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ رکمن کی ماں! یہ تو
جی سے چاہتا تھا کہ کب چھٹی ملے۔ اور کب یہ مٹکو کے ساتھ گلچھرے اڑائے۔ اور
رنڈوے کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ان چارپائیوں، ان برتنوں کے ساتھ اسے
بھی ایلومینیم کا ایک پچکا ہوا ناکارہ برتن سمجھ کر باہر پھینک دیا گیا اور اس کے
بچوں کو بھی۔ لوگ اصرار کرنے لگے کہ بڑا پلنگ گیارہ برتن، ایک کامدار جوتا
ایک شال اور ایک کوئی یونہی چھوٹا سا زیور خاندانی پروہت کو واں کہا جائے
اس وقت اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ تم رنڈوے نہیں ہو لیکن ملال تھانے دار
کی بیوی محلے کی سب عورتیں، دنیا کے مرد اس کے اردگرد پکار پکار کر کہہ رہے
ہیں۔ ارے کمبخت! تم رنڈوے ہو گئے ہو۔ تمھیں ایک عورت کی نعمت سے
محروم کر دیئے گئے ہو۔ تم دنیا کے سامنے روسیاہ ہو۔ تم مر کیوں نہ گئے۔ حالانکہ
تمھاری بیوی موت کی آغوش میں سو چکی ہے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ زہر کھا لیتے۔
وحشیوں کا رواج کتنا اچھا ہے کہ وہ خاوند کے مر جانے پر بیوی کو اور بیوی کے
مر جانے پر خاوند کو اس کے ساتھ غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ ایک کو دوسرے
کے بعد جینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس وقت سخت اضطراب میں رنڈوے
نے پھر کتاب کی طرف رجوع کیا تھا۔ اور پھر حسب حال الہام ہوا تھا۔
گل بکاولی کا قصہ ختم ہوا بوجھ ہلکا ہونے کی بجائے بڑھ گیا اور اس غم کو

اور بوجھل بنانے کے لیے خفت بھی شامل ہو گئی۔ بنگلے میں سوتے ہوئے اُسے
تمام رات اپنی حماقت کا خیال آتا رہا اور وہ سوچنے لگا کہ بیوی کی موت کے
چھٹے روز اس کا سینما دیکھنا کس حد تک جائز ہے۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو کہہ دیتا
—— جائز ہے، بالکل جائز ہے۔ اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ اور وہ
کپڑے پھاڑ کر بنگلے سے باہر بھاگ جاتا۔ مگر اخلاق کے سب مجسموں نے اُسے روکے
رکھا اور برابر کہتے رہے تم نے بُرا کیا۔ لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل میں
بار بار اُٹھتا تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر اُس کا بارہ برس کا بیٹا ساتھ نہ ہوتا اور وہ
دنیاوی اقدار کے مطابق اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے شراب کے چند گھونٹ
پی لیتا اور کسی طوائف کے ہاں رات گذار دیتا تو کیا اخلاقی تعزیرات کے
مطابق وہ واجب التعزیر تھا۔

رات کے پچھلے پہر وہ بڑبڑا کر اُٹھا۔ اور بولا —— تو ثواب کی حدود
کہاں سے شروع ہوتی ہیں؟ ...... اس وقت بچے کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اُس نے
آنکھیں ملتے ہوئے کہا، باجی! دربار صاحب کی حدود گھنٹہ گھر سے شروع ہوتی
ہیں۔ لیکن آپ کو اس وقت تانگہ نہیں ملے گا ...... چپ رہ کتے کے پلے،
سوجا، ثواب کی حدود گھنٹہ گھر سے شروع ہوتی ہیں۔ تانگہ نہیں ملے گا۔ اور دن بھر
کی دماغی الجھن اور شب کی ذہنی کشمکش کا حاصل یہی تھا کہ گل بکاولی کے ہیرو کی
طرح کیا شراب و شباب میرے غم کو ہلکا کرنے کی بجائے بڑھا نہیں دیں گے!
رنڈوا امرت سر میں ایک دن گذارنے کے بعد لوٹ آیا۔ اُس کے
بیٹے نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ وہ مرنے والے کے پھول گنگھل میں بہانے گئے

بجائے بیاہ میں پھینک کر چلے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُسے اس راز کے
اخفا کے لیے تاکید نہیں کی گئی تھی۔ باپ اور بٹیا دونوں مل کر جھوٹ بولتے رہے
اور کہتے رہے پانڈوں نے ہمارا سو روپے کے قریب دان کروا دیا۔ اور انھوں نے
ہمارے خاندان کا شجرہ بالکل ٹھیک سنایا۔ لیکن سینما کے متعلق چونکہ لڑکے کو
اخفا کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس لیے اُسے اس وقت تک چین نصیب نہ ہوا
جب تک کہ اُس نے یہ بات کسی کو کہہ نہ ڈالی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد
رنڈوے کے لیے زندگی دوبھر ہو گئی۔ وہ شخص جو اپنی موت کے چھٹے روز تفریح
گاہ میں جا سکتا ہے اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُسے مرنے والی سے
محبت تھی۔

اس کے بعد بھی منکو جہترانی آتی رہی۔ دراصل وہ بہت ہمدرد عورت
تھی چونکہ وہ خود بیوہ تھی اس لیے۔ وہ ایک رنڈوے کے تاثرات کو جان کر خوش
ہوتی تھی۔ اور آنسو بہاتی تھی۔ وہ رنڈوے کی دُکھتی رگوں کو طرح طرح سے
چھیڑتی۔ چند دن کے بعد رنڈوے نے اُسے مزید تاثرات بتانے سے انکار کر دیا
لیکن وہ عموماً فرش پر جمتے ہوئے صابن کو چھیلنے کے لئے کھڑی ہو جاتی اور اپنے
آپ کہنے لگتی ـــــ "مالکن، خدا اُسے بہشت نصیب کرے۔ وہ تو ایک بہت
اچھی عورت تھی بابوجی، میں جھوٹ نہیں کہتی اس کا نام لیے تو آج بھوکے کو روٹی
ملے۔ اُس نے کبھی کوئی دن تیوہار نہیں جانے دیا جبکہ کہ میرے پلو میں ترچا دُنی
نہیں باندھ دی۔

لیکن ایسی باتوں کا رنڈوا تجزیہ کر لیا کرتا تھا۔ ان باتوں کے باوجود اس نے

بھنگن کو اٹھنی ماہانہ سے زیادہ نہیں دیا اور وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا کہ منکو کو اپنے
ہاں ذرا دیر تک روکے۔ لیکن جہاں اُسے تجزیے کی ضرورت تھی۔ وہاں وہ تجزیہ
نہ کر سکا اور جہاں تجزیے کی ضرورت نہ تھی وہاں وہ اخلاق کی حدود سے گذر گیا
جہاں اُس بھنگن کو دو چار گالیاں دے کر نکال دینا سماجی نقطۂ نگاہ سے کوئی
مخرب اخلاق بات نہ تھی وہاں اس نے اخلاق کا دامن تھام لیا اور یہ باتیں محض
اس وجہ سے ہوئیں کہ وہ رنڈوا تھا۔ کبھی کبھی وہ معمولی باتوں پر سیخ پا ہو جاتا اور کبھی
شدید باتوں کے سامنے بکمل طور پر مستغنی۔ کبھی اُس کے دماغی قوائے یک لخت تن
جاتے اور کبھی اختلال کی حد تک اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے وہ مفید وغیر مفید
میں امتیاز کرنے سے قاصر تھا...... اس کی بچیوں کے سامنے سے کوے
روٹی اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ لیکن کوئی کوؤں کو منع نہ کرتا۔ نہ کوئی عورت رحم کھا کر
اُن کے روکھے بالوں میں تیل ڈالتی۔ اُن کے بال کچی بیکھوں اور پلکیں جھوؤں سے
سفید ہو رہی تھیں رنڈوا کئی دفعہ اُن کے لیے ماں بننے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی
بیوی طرح روٹی کو 'گوگو' کے نام سے پکارتا ـــــ گوگو کھائے گا بیٹا، میرا اپنا منّا
گوگو کھائے گا..... لیکن اسے فوراً ہی محسوس ہوتا کہ وہ گوگو کا لفظ اس بے ساختگی
سے اُس محبت سے ادا نہیں کر سکا۔ اُس وقت وہ پیار کی بجائے دونوں کی معمولی
سی ضد پر بھی ایک چپت لگا دیتا۔ اور اِن دنوں جب کبھی وہ محلہ میں نکلتا تو ہمیشہ اُسے
دائیں یا بائیں طرف سے آوازیں آتیں یہی ہے وہ رنڈوا ـــــ جس نے اپنی بیوی
کی مرنے کے چھٹے روز تھیٹر دیکھا تھا۔ یہی ہے وہ رنڈوا جس نے.........
رنڈوے نے اپنے آپ کو مدافعت کے لیے بہت کمزور پایا۔ اور ایک

رات لوگوں کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر اُس نے چپکے سے مکان چھوڑ دیا۔
اور اپنی دونوں توام بچیوں کو کندھوں پر اُٹھائے اور کرایہ کے ایک چھکڑے
پر سامان لادے وہ شہر کے کسی اور کونے کے لیے چل دیا۔ رات اس نے کمیٹی
کے باغات میں کاٹی اور صبح وہ کرنیل گنج میں بدرو کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں
مذبح کے قریب دو کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ اور ان کوٹھڑیوں کے پڑوس میں چنڈال
رہتے تھے جو کہ مویشیوں کے ہسپتال میں مرنے والے اور ذبح خانے میں ذبح
کیے جانے والے جانوروں کی آنتیں سکھا کر کمانوں اور چھاجوں کے لیے تار بنایا
کرتے تھے۔ اور جب ان کے گھروں کی طرف سے بُو اڑ کر جاتی تو ناک سڑ جاتی۔
لیکن سوائے اس جگہ کے رنڈوے کو کوئی باعزت جگہ نہ مل سکی رنڈوا ایک نوع
سے بدرو کے کنارے پہ رہنے سے خوشی محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ بدرو میں شہر بھر کی
تلچھٹ آتی تھی اور وہ بھی اپنے آپ کو تلچھٹ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن وہ ان آنتوں
کی بدبو برداشت نہ کرسکا جو ہر روز صبح اُٹھتے ہی اُس کے دماغ میں آیا کرتی تھی۔
اس کے علاوہ اس کی معاشرت نے اُسے بچپن سے ہی گائے کی عزت کرنا سکھایا
تھا۔ لیکن اتنی مصائب کے باوجود وہ گائے کا احترام کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ اور
جب گائے کا گوشت اُس کی نظروں کے سامنے سے گذرتا تو اُسے نہایت
شدت سے محسوس ہوتا کہ وہ رنڈوا ہو گیا ہے۔ لیکن اس تہمت نے کرنیل گنج تک
رنڈوے کا پیچھا کیا۔ اور ایک دن اُس نے پڑوس کے بوچڑ کی بیوی سے وہی
سینکڑوں مرتبہ دہرائے گئے الفاظ سنے ——— یہ وہی رنڈوا ہے جس نے اپنی
بیوی کے مرنے کے چوتھے روز ہی سینما دیکھا تھا رنڈوے کا اس محلے کو چھوڑ کر اس سے

زیادہ خوفناک قعرِ مذلت میں گرنا ممکن ہی نہیں تھا وہ کبھی کبھی دروازے پر بیٹھ کر سوچنے لگتا — انسانیت نے ترقی کیا کی ہے بس یہی کہ اُس کا ہر فرد چوراہے پر ہر روز اُس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے — یہی ہے وہ مرد جس نے اپنی بیوی کے چھٹے روز سینما دیکھ لیا تھا۔ ایک قسم کی ستی کی رسم سماج نے ابھی تک روا رکھی ہے انسان نے کچھ بھی ترقی نہیں کی۔ وہ ننگے پن سے گرا اور اس نے لبادہ بنایا اور لبادے سے پندرہ ہزار برس کے عرصے میں اس نے مکلف کالروں والی قمیص تیار کی ہے۔ اور ابھی تک وہ اتنی ترقی نہیں کر سکا کہ تمام کپڑے اتار پھینکے۔ وہ آزاد محبت کرنے کی وجہ سے دائمی رنڈاپے سے آزاد ہو جائے۔ اُسے اتنی بھی شخصی آزادی نہیں کہ وہ خودکشی کرے۔ مذہبی کتاب کو پھر کھولنے پر اُسے احساس ہوا کہ کتاب پر ایک کڑی تنقید کی جا سکتی ہے۔

بیوی کی موت کے چار ماہ کے اندر اندر وہ اپنی زندگی کو بے کار اور بے مصرف سمجھنے لگا اور اس ذہنی کوفت اس سخت تنہائی سے بچنے کے لیے ایک عورت کی پناہ ضروری تھی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ در اصل اُسے اپنی عمر کے تقاضے کے مطابق کسی عورت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور پھر اس کی بیوی کو مرے فقط چار ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ اس شخص کو اپنی بیوی سے ذرا بھی محبت نہیں تھی اور وہ اس بات کا منتظر تھا کہ کب اُس کی ارتھی اُٹھے اور اس کی عیاشی ممکن ہو سکے۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے گل بکاولی کا کھیل پھر گیا اور سوچنے لگا کہ دوسری شادی اگر اس کے معاملے میں ممکن بھی ہو جائے تو کیا اُس کی طبیعت کا اضمحلال

دور ہو جائے گا۔ ان دنوں اسے ایک فسٹ کلاس مجسٹریٹ کی کچہری میں پیادے کی آسامی مل گئی۔ بیوہ عورتیں اپنے بچوں کی جائداد کے لیے وراثت کی سندیں حاصل کرنے آتیں تو وہ ان سے بے تحاشا روپے اینٹھا کرتا۔ مرد دیوانی میں اس کے سامنے خراب ہوا کرتے اور وہ اُن سے کثرت سے رشوت لیا کرتا اور ایسا کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ بھی کبھی انسان تھا۔ وہ صاحب کے بنگلے میں آڑوؤں کی چھاؤں تلے صاحب کی ٹانگیں دبا دبا کر بہت سے کام نکال لیا کرتا۔ اس چار پانچ ماہ کے عرصے میں اس نے لوگوں کی خوب اچھی طرح سے کھال ادھیڑی۔ اُسے روپیہ پا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی روپے چھین کر ہوتی۔ روپے ہاتھ میں آنے سے پہلے اُسے روپوں کی خواہش ہوتی اور جب لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر وہ اُس کے اپنے ہاتھوں میں چلے آتے تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ روپے اب ٹھیکری ہو گئے ہیں لیکن وہ ان ٹھیکریوں کو ہی لوگوں کو ادھار کے طور پر دینے لگا۔ اور زیادہ سے زیادہ سود لگانے لگا

ان دنوں اس کی اپنی سالی سے خط و کتابت تھی۔ اس کی سالی تیس پینتیس برس کی ایک چھوڑی ہوئی عورت تھی۔ اور رنڈوا اُسے اپنے گھر میں ڈال کر اپنے آپ سے انصاف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر روپے اس کے ہاتھ میں ٹھیکری ہو جاتے تھے تو وہ سوچتا کیا بڑھاپے میں ایک نوجوان عورت اُس کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی جوانی نہیں کھو بیٹھے گی؟

اچھا ہوا کہ رنڈوے کو اس ذہنی کشمکش میں خودکشی کی حد تک شخصی آزادی حاصل کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ معمولی سا بیمار ہوا، سردی لگی اور مر گیا۔ مرنے میں

اسے بہت وقت پیش نہ آئی۔ صرف دو ایک تکلیف دہ ہچکیاں آئیں اور وہ مر گیا ——— مر گیا!

رنڈوے کا مر جانا بھی کوئی سانحہ ہے؟ لے دے کر صرف یہی بات تکلیف دہ تھی کہ دو بچیاں رہ گئی تھیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا یا دوسری بات یہ تھی کہ محلے کے لوگ پوچھتے تھے۔ رنڈوا مر گیا؟ سچ مچ مر گیا؟ ——— حالانکہ اس کے مرنے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

رنڈوے نے کافی پیسے چھوڑے اور مرنے کے بعد جب اُس کے بوسیدہ ٹرنک کی تلاشی لی گئی تو اُس میں چند عشقیہ خطوط نکلے جو مرنے والے نے اپنی سالی کے نام لکھے تھے اور پوسٹ نہیں کئے تھے۔ اور جن میں گڑگڑا کر شادی کے لیے استدعا کی تھی۔ اس ضمن میں بھی رنڈوے سے ایک لغزش ہوئی۔ وہی عام لغوی لغزش ——— وہ اپنے خط جلا سکتا تھا۔ لیکن خدا جانے اسے اپنے خط کیوں عزیز تھے۔ اس کے علاوہ اگر وہ ذرا بھی احتیاط سے کام لیتا تو خطوط کے اوپر تاریخ نہ دیتا یا انھیں پوسٹ کر دیتا۔ لیکن گل بکاولی کا قصہ دہرانے کی ہمت ہی اس نے انھیں وہیں رکھ دیا تھا اور لوگوں کو پتہ چل گیا کہ رنڈوا اپنی سالی پر نگاہ رکھتا تھا۔

رنڈوے کے بیٹے نے کتاب کی راکھ پر زندگی سے ایک افسانہ تعمیر کیا۔ اور اس کا نام رکھا ——— "گل بکاولی" اور جب وہ اپنے آپ کو بہت بڑا تاج الملوک تصور کرتا تو لوگوں کے سامنے شور مچانے لگتا ——— "میرا باپ بے قصور آدمی تھا" ——— لوگ اسے جنونی سمجھ کر ہنس دیا کرتے۔ اور جب کبھی

وہ بازار میں نکلتا تو لوگ اُس کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہتے۔ "یہ اُسی رنڈوے کا بیٹا ہے جس کے نفس کی آگ بیوی کی موت کے چھ ماہ کے اندر اندر ہی بھڑک اٹھی تھی۔"

ممتاز مفتی

آپا

ممتاز مفتی عالم نفسیات کا مسافر ہے، وہ دل کی دھڑکن، نبض کی دھمک، آنکھ کی جھپکی سے اپنی کہانیوں کے پلاٹ تلاش کر لیتا ہے، وہ واقعاتی داستانوں کا قائل نہیں، کہ وہ تحت الشعور کے غاروں میں اتر کر ہمارے لیے قسم قسم کے اسرار چن لاتا ہے۔ مڑے مڑے کر انہیں کھولتا ہے اور کہیں بیچ ہی چھوڑ کر چل دیتا ہے، اس کا افسانہ کسی خاص شخصیت کی داستان نہیں ہوتا — وہ ہر انسان کی ذہنی الجھنوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔

"آپا" میں بھی ممتاز مفتی انہیں نفسیاتی میدانوں، جذباتی لالہ زاروں اور تحت الشعوری دھندلکوں میں محو پرواز ہے، ایک لجاتی سمٹتی لڑکی کے دھڑکتے ہوئے دل کے ہر کونے کھدرے سے وہ اس کے احساسات وخیالات کی سیپیاں اکھٹی کرتا ہے، اور ادھ جلے اُپلے کے استعارے میں آپا کے سارے کردار کو سموتا ہر پڑھنے والے کو سوچتا چھوڑ جاتا ہے، اور یہی فنکار کی سب سے بڑی عظمت ہے

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے۔ تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے۔ جو مدھم سی لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے۔ ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا، ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہوگا، کہنے لگا، "امی جان میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"اوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں "اچھا بدو تمھارا بیاہ آپا سے کردیں۔"

"اوہوں" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں آپا کو کیا ہے۔"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا، جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو، پھر اس کی نگاہ چولھے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا، بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی" پھر بجلی کے

روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا" اور چھا جو باجی ایسی" اِس بات پر ہم سب بہت دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے! اماں کہنے لگیں "تصدق بدو سے پوچھنا تو کہ آپا کیسی ہیں" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا۔ تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے "بتاؤں"! بدو چلایا۔ اور اس نے اُپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اُسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونھ" بدو رونے لگا۔ تو اماں کہنے لگیں "پگلے" اُسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے اس میں چنگاری ہے"۔ "وہ تو جلا ہوا ہے اماں" بدو نے بسورتے ہوئے کہا! اماں بولیں "نہ میرے لال تمھیں نہیں معلوم' اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی بدو نے بھولے پن سے پوچھا "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی "میں کیا جانوں" وہ بھر بھرآئی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی۔ اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔ مگر میں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی" اور اپنے کام لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیخنا "آپا میرا دلیا" ادھر ابا گھورتے۔ سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی

بیچ میں اماں بول اٹھتی "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نبٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی۔ مگر اس کے باوجود خدا جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ کام کر رہی ہے۔ یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی بہت دیر لگتی ہے۔ اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی، اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے سنا تھا، زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس البتہ وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں کسی اثر سے بھیگ جاتیں۔ گویا کسی ندی کے کنارے چاندنی میں کوئی کھوج میں سندھی بھیروں الاپ رہا ہو، مگر ان دنوں مجھے چاندنی اور سندھی بھیروں کا کیا پتہ تھا۔ اس لیے میں سمجھتی تھی۔ کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے، جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی۔ جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو، اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا۔ کہ باجی ہمیشہ میرے پاس ہی رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر مجھے آوازیں دیے "ہیں جی۔ کیوں جی" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں، باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔ ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں بس میرا جی چاہتا تھا۔ کہ انھیں کے گھر جا رہا ہوں۔ ہمارے گھر میں

رکھا ہی کیا تھا، ایک بیٹھ رہنے والی آپا۔ ایک "یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑ گڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں معلوم ہوتا ہے۔ ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے۔ "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں۔ اور یا قہقہے لگتے ہیں۔ جیسے کوئی میلہ ہو۔"

اماں تنک کر بولیں۔ مجھے کیا معلوم آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے۔ "اُفوہ۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی۔ برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات قطعی نہیں" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی ہاں۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا۔ کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اس بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا۔ اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس پیا اور گڑ گڑ کر لیا، یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے۔ اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو سارے

گھر میں لے دے کر صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری سی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔

خدا جانے وہ کونسا شعر تھا — ہاں

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انھیں گاتے ہوئے سُن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی۔ تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدو روما" اور پھر آپ ہی آپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ تصدق بھائی ہمارے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے، انھیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی۔ تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس پر خوب لڑیں کہنے لگیں۔ اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے۔ کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہے۔ غرض کہ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک ہفتے کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے، ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے ہی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو

آپا کے دوپٹے کا پلو آپی آپ سرک کر نیم گھونگٹ سا بن جاتا۔ اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے۔ کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے۔ لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے "بدو تمھاری آپا کیا کر رہی ہے"۔

"آپا" بدو لاپروائی سے دہراتا۔ "بیٹھی ہے —— بلاؤں"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں۔ نہیں۔ اچھا بدو آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں"۔

اور جب بدو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ تو مدھم سی آواز میں کہتے "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو"

بدو چیخ اٹھتا "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے دیکھا؟ جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈگمگ ڈگمگ سمجھے؟" آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی۔ اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپی آپ مسکراتی، اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی کوئی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی۔ اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں، آپا کے ہونٹ یوں ہلتے۔ گویا وہ گا رہی ہے۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے، ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آجاتے تو وہ ٹھٹک کر یوں اپنا دوپٹہ بال اور آنکھیں سنبھالتی، گویا کسی بے تکلف

محفل میں کوئی بیگانہ آگھسا ہو۔

ایک دن میں آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے میرا خیال ہے بھائی کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے۔ "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے۔ جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے، یوں ڈزنٹن ڈر اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے۔ سمجھے"

بدو بولا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اُونہہ" بھائی نے کہا۔

بدو چیخنے لگا "میں جانتا ہوں۔ تم آپا سے بیاہ کرو گے، ہاں"۔ اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی۔ جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے "واہ تمھاری آپا فرنی پکاتی ہے۔ تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو۔"

بدو نے کہا۔ "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔"

وہ بولے۔ "تو وہ اپنے ابا کے لیے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لیے تو نہیں۔"

"میں کہوں آپا سے"؟ بدو چیخا

بھائی بولے "اوہ بگلا۔ ڈھنڈورا۔ تو تمیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ

دیکھو۔ اس طرف ڈگمگ ڈگمگ ڈگمگ" بدو پھر چلانے لگا۔" میں جانتا ہوں
تم میز بجا رہے ہونا۔" ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پیٹتا ہے نا۔" بھائی کہہ رہے تھے
کشتیوں میں۔ اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاماں
اور تم بدو پہلوان لو۔ آؤ۔ ٹھہرو۔ جب میں "میں کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انھوں
نے مدھم آواز میں کہا۔ ارے یار تمھاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے، آپا ہنسی نہ روک سکی۔ اس لیے وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں
چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ اور اماں نے تو اپنے منہ میں دوپٹہ
ٹھونس لیا تھا۔ کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کہ بھائی صاحب آ گئے
کہنے لگے۔ کیا پڑھ رہی ہو۔ ج ہے نا۔ ان کے منہ سے "جھینا" سن کر مجھے بڑی خوشی
ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام
تھا۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا۔" میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس
کیا کرتی تھی۔ جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا
ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال
حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جھینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور
یہ محسوس کرتی۔ گویا میں ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجاوہ سے سجدے کہا کرتے
تھے۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اُسے سجدے
نہ کہتے۔ بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا
سکول کا کام کر رہی ہوں۔

پوچھنے لگے۔ "تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں"۔

انھوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تمھاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی" غالباً وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا۔ اور مدھم سی آواز میں کہا "نہیں" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی بولے۔ "اوہ کیا بتاؤں جہنیا کہ وہ کیا چیز ہے۔ نشہ ہے نشہ۔ خالص شہد۔ تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے۔ یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا میرے پاس پڑی ہے۔

میں نے کہا۔ "ضرور پڑھوں گی"۔

پھر پوچھنے لگے۔ "میں کہتا ہوں تمھاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟

میں نے چڑ کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ خود ہی پوچھ لیجیے"۔

حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا۔ کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی۔ میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعہ کے بہانے میلہ ہو رہا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی۔ کہ وہ گھر بیٹھ رہنے کے لیے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی

آئی تھی نکتہ چیں۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی۔ اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب۔ میں کیا ٹیلیفون تھی۔ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا۔ بیٹھی ہوئی گم صم آپا بھیگی بلی!!

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اُٹھے "آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ سجادہ بیٹی۔ کیا کھانڈ اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے۔ کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گیا ہو" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید۔ کیا خوب شاید۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے" صحن سے اماں دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں۔ تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا خیال کرنا چاہیے" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ کہنے لگے "اوہ یہ بات ہے۔ مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں۔ سجادہ کی ماں" —— اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی۔ تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا تو ان سے

ملنا تو کیا بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھول چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا۔ ضرور ہی کوئی بھید ہے اِس بات میں کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی۔ اور کسی نہ کسی بات سے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی۔ تو آپا بڑی بے دلی سے وہ ایک باتوں ہی پر اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے۔ اور میں یہاں کھڑی ہوں" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ مگر آپا جب لوٹ چکی۔ تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی، باتوں باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا آج آپا آئی تھی۔

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ خدا جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں "ہارٹ بریک ہاؤس"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اُسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی۔ جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا۔ کہ میں سو چکی ہوں۔ تو دراز کھول کر وہ کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی میں سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس" کا مطلب کیا ہے؟ دل توڑنے والا گھر۔ اس کے کیا معنے ہوئے!" پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی۔ پھر وہ

سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی" ہارٹ بریک ہے"

کہنے لگی" میں کیا جانوں"۔

میں نے اسے جلانے کو کہا" ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اس کے دل کو لگی ہو گی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یونہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی پہلے تو بھائی جان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے' پھر پوچھنے لگے" بہینا اچھا یہ تو بتاؤ۔ کیا تمھاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے۔ میں نے کہا۔ میں کیا جانوں۔ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے ہنس کر کہنے لگے۔ آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو"

"کیوں میں لڑاکا ہوں!" میں نے کہا۔

"بولے" نہیں ابھی تو لڑکی ہو' شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے۔ دیکھو بہینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے۔ ذرا نہ اکتائے"۔ جانے کیوں۔ مگر میں شرما گئی۔ اور بات بدلنے کی خاطر میں نے پوچھا" فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان"

بولے وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید' لال لال' کالا کالا' نیلا نیلا' سا' میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی پھر وہ کہنے لگے" وہ مجھے بے حد پسند ہے' یہاں تو ہے نا ہم فرنی کھا کھا کر اکتا گئے" میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی

ہو گی۔ چونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا، تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی، ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔ بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے۔ اس میں کیا ہے۔

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا، حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدو۔ جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو کہ اس کھانے کا کیا نام ہے۔

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی۔ اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ پہلی مرتبہ آپا نے مجھے یوں گھورا تھا۔ اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا۔ کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں۔ مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو "چھاجو باجی چھاجو باجی" چیختا پھرتا اور کہتا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔

باجی کہتی "شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی۔ کہ اس کی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی "ہے نا بھئی جاآن۔ کیوں جی؟

باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" ایسا بھلا سنائی دیتا۔ کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھلا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو' اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اس سارے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا۔ کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ ایسی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں ہنستی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا۔ کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے بھئی جاآن میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی ہوگیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا' وہ باجی کے ارد گرد پھرتا رہتا اور باجی بھائی جان کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔ باجی کہتی "بھائی جاآن ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے۔ کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟ باجی بول اٹھتی۔ آپا سے پوچھیے۔ بھائی کہتے اور "تم" باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے میں سنجیدگی پیدا کر لیتی۔ بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی۔ پھر کہتی "اونہہ" "مجھ سے تو آپ پٹ

جائیں گے۔" بھائی جان کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ اور کہتے۔ کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا! "وہ جواب دیتی" میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو، ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے، اور پھر یوں ہنستی جیسے گلے میں گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی، چھاجو باجی، کہتا ہوا۔ باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ بھئی جا آن تو صرف چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انھیں جو خوش رکھنا ہوا ہے نا بھئی جا آن" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے پھر باجی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے، باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی "لیجئے بھئی جا آن" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا، کہ آپ بھی کہتے ہوں گے۔ کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے کس نے بنایا ہے یہ؟" باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لیے" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا "میں بتاؤں بھائی جان"۔
—— آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئیں

باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے
باجی کی طرف دیکھا۔ پھر خدا جانے انھیں کیا ہوا اُن کا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا اور
آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ خدا جانے کیوں۔ میں نے یوں محسوس کیا
جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں جھٹ باہر چلی آئی
باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں
کچھ کہا۔ آپا نے اپنے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑیئے
چھوڑیئے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے
میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمولی
بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ کہنے لگی "آج ایک دندناتا بورڈ کرو کھاؤں
کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے، واہ یہاں سے ٹک لگاؤں تو خدا
جانے کہاں جا پڑو" غالباً اُنھوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ
بناوٹی غصے میں چلائی "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے رہتے ہیں۔"
بھائی جان معاً بول اُٹھے۔ "تو کیا ہاتھ سے"— "چپ چاپ خاموش"
باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی
پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا "آپا اندر بھائی جان باجی
سے کشتی لڑ رہے ہیں چلو دکھاؤں تمھیں۔ چلو بھی" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔
آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور وہ بت بنی کھڑی تھی، بدو نے

آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ اماں کہاں ہے' اور وہ کمرے میں اماں کے پاس جانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ کہنے لگی آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔ بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ آؤ۔ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی دن شام کو میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی' شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو' بہر صورت میں حیران ہوں کہ بات کیا ہے آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی ہے۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار اُن کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ رہی تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اور ماتھے پر شکن سی چڑھی رہتی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے بھائی کہنے لگے "بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"اونہہ" بدو نے کہا۔ ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں"۔

میں نے پوچھا۔ بھائی جان یاد ہے۔ جب بدو کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔ اماں نے پوچھا۔ آپا سے کیوں نہیں۔ تو کہنے لگا۔ بتاؤں آپا کیسی ہے"۔ پھر چولھے میں ایک جلے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "ایسی" اور چھاجو باجی؟ میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے

اشارہ کیا "ایسی" عین اس وقت بجلی بجھ گئی۔ اور کمرے میں آگ کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا" ہاں یاد ہے" بھائی نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لیے باہر چلی گئی۔ تو بھائی کہنے لگے "خدا جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے"۔ آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا "اف کتنی سردی ہے" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے۔ اور۔ ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے بولے ممانی سچ کہتی تھیں۔ کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے اور پر نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی۔ جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو، میرا خیال ہے آپا کا آنسو گرا ہو گا۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے، دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

اپندرناتھ اشک

قفس

اگر اردو کے کسی افسانہ نگار نے ہمیں ہندو خاندانوں کی گھریلو زندگی کے اسرار سے مکمل طور پر روشناس کیا ہے، تو وہ صرف اپندر ناتھ اشک ہے اشک کی نگاہ گہری اور مطالعہ وسیع ہے، وہ ذرا ذرا سے واقعات کو ایسے استادانہ انداز میں افسانے کا رنگ دیتا ہے، کہ ہمیں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ایک افسانہ معلوم ہونے لگتا ہے، ہندی کا ادیب ہونے کی وجہ سے اشک اردو میں بھاری بھرکم تراکیب اور دور از کار استعاروں کو روا نہیں رکھتا، اس کی زبان بے حد سلیس اور رواں ہوتی ہے، اور ہمیں کہیں وہم تک نہیں گزر سکتا، کہ اشک نے یہاں جان بوجھ کر مفکر یا عالم بننے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر افسانہ اس کے مخصوص رنگ کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے، ایک سیدھے سادے سمجھنے والی ہندو دیوی کی سوچ بچار میں گومتی ایسی سانولی غریب اور مخلص لڑکی کے کردار کو سائے کی طرح لہرا کر قاری کو شانتی کے احساسات کا حصہ دار بنا دینا اشک کے فن کا اوج کمال ہے اور پھر افسانے کی روانی اتنی مسلسل انداز اتنا سادہ اور موضوع اتنا دردناک ہے، کہ افسانہ ختم کرنے کے بعد تلخ حقائق ہمیں قفس کی تیلیوں سے جھانکتے۔ ہماری سماج کا منہ چڑاتے، اور ہمیں اپنے گھروں اور گھر والیوں کے متعلق ایک سوچ میں مستغرق کرتے فرسودہ اقدار کے شکنجوں میں گھسے معلوم ہوتے ہیں۔

شانتی نے جھنجلا کر کاغذ کے ٹکڑے کر دیے اور اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں گھومنے لگی۔ اسے یک سوئی حاصل نہ تھی۔ لکھتے لکھتے اس کا خیال کہیں سے کہیں چلا جاتا تھا۔ صرف چار سطریں لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن جو کچھ لکھنا چاہتی تھی اس سے لکھا نہ جاتا تھا۔ جذبات کی رو میں کچھ کا کچھ لکھ جاتی تھی۔ وہ چھ خط پھاڑ چکی تھی۔ یہ ساتواں تھا۔

گھومتے گھومتے، وہ چپ چاپ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ شام کا سورج دور مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ مالی نے کیاریوں میں پانی چھوڑ دیا تھا اور دن بھر کے مرجھائے ہوئے پھول گویا نئی زندگی پا کر کھل گئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ شانتی نے دور ——— ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ دوڑائی پیلی پیلی سنہری کرنیں گویا ڈوبنے سے پہلے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے کھیل میں جی بھر کر حصہ لے لینا چاہتی تھیں جو سامنے کے میدان کی ہری بھری گھاس پر آزادی سے کھیل رہے تھے۔ سڑک پر دو غریب نوجوان لڑکیاں ہنستی کھیلتی چہلیں کرتی چلی جاتی تھیں۔ شانتی نے لمبی سانس لی اور پھر مڑ کر اپنے اِرد گرد ایک تھکی ہوئی نگاہ دوڑائی ——— چھت پر بڑا پنکھا ہلکی بھاری سی آواز سے لگاتار چل رہا تھا۔ دروازوں پر قیمتی پردے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اور بھاری کوچ اور ان پر رکھے ہوئے ریشمیں گدے، اور غالیچے اور بیچ میں رکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور ان پر پیتل کے ننھے ننھے ہاتھی اور پھولدان ——— اور اس نے اپنے آپ کو اس ننھی سا محسوس کیا

جو اس وسیع آسمان کے نیچے کھلی آزاد ہوا میں، آم کی ڈالی سے بندھے ہوئے پنجرے میں لٹک رہا ہو۔

اس وقت نوکر اس کے چھوٹے لڑکے کو زبردستی کھینچتا ہوا لایا۔ دھوبی کی لڑکی سے وہ کھیل رہا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور شانتی کے لڑکے کو پیٹ دیا۔۔۔ "کیوں تو ان کمینوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ کیوں کھیلتا ہے تو، اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہو کر اور اس کی آواز چیخ کی حد کو پہنچ گئی۔ حیرت زدہ نوکر نے بڑھ کر بچے کو زبردستی چھڑا لیا۔ شانتی جا کر دھم سے کوچ میں دھنس گئی اور اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

....

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کئی تصویریں پھر گئیں۔

....

اُس وقت اس کے خاوند نے لانڈری کا کام شروع ہی کیا تھا۔ بابل سوسائٹی کے سامنے، جہاں آج کل ایک دندان ساز دھڑلے سے لوگوں کے دانت اکھاڑنے میں مصروف ہے، ان کی لانڈری تھی۔ آمدنی اچھی تھی، لیکن خرچ بھی کم نہ تھا۔ ۴۵ روپے تو دکان کا کرایہ ہی دینا پڑتا تھا اور پھر کپڑے دھونے اور انہیں استری کرنے کے لیے جو طویلہ لے رکھا تھا۔ اس کا کرایہ الگ تھا۔ اِس کے علاوہ دھوبیوں کی تنخواہ، کوئلے، مسالہ اور بیسیوں اور جھگڑے۔ اِن تمام اخراجات کو نکالنے کے بعد جو تھوڑا بہت بچتا تھا۔ اس سے مشکل کے ساتھ گھر کا خرچ چلتا تھا اور گھر انھوں نے دکان کے پیچھے کی گلی ہی میں لے رکھا تھا۔

یہ گلی جیسی اب ہے، ویسی ہی تب بھی تھی اگرچہ مکانوں کی صورت اس
دس برس کے عرصے میں کچھ بدل گئی ہے، لیکن مکینوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں
ہوئی۔ اب بھی اس علاقے میں ادنیٰ طبقے کے لوگ بستے ہیں اور تب بھی بستے
تھے۔ نمدار اندھیری کوٹھڑیوں میں چمار، جھیور، گوجر اور شدھ ہندو رہتے ہیں
——— ایک ہی کوٹھڑی میں رسوئی، بیٹھک، سونے کا کمرہ اور وہ بھی ایسا،
جس میں ساس سسر بیٹا بہو، لڑکیاں لڑکے، سب ایک ہی جگہ سوتے ہیں۔

جس مکان میں شانتی رہتی تھی۔ اس کے نیچے ایک طرف ٹینڈی چمار،
اپنے آٹھ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسری چوڑی گلی کی طرف مارواڑی
بنیئے کی دکان تھی اور تیسری طرف، جدھر دروازہ کھلتا تھا۔ بھنگیوں نے تنور
لگا رکھا تھا۔ جس کا دھواں صبح شام ان کی رسوئی میں آجایا کرتا تھا۔ اور شانتی،
گرمیوں کے موسم میں بھی رسوئی کی کھڑکی کو بند رکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔

گرمیوں کے دن تھے اور کمیٹی کا نلکا کافی دُور بازار کے موڑ پر تھا۔ اس لیے
شانتی نے اِرد گرد کے غریبوں کی سہولت کے خیال سے اپنے خاوند کے
اصرار پر، ان کو نیچے ڈیوڑھی کے نلکے سے پانی لینے کی اجازت دے دی تھی۔

لیکن جب انھیں اس مکان میں آئے کچھ دن بیتے تو شانتی کو معلوم
ہوگیا کہ یہ فراخ دلی بہت مہنگی پڑے گی۔ ایک دن، جب نہانے کے بعد
اس کے پتی صابن دانی نیچے ہی بھول آئے اور شانتی اسے اُٹھانے گئی۔
تو وہ ندارد تھی۔ پھر کچھ دن بعد تولیا غائب ہو گیا اور اسی طرح دوسرے
تیسرے کوئی نہ کوئی چیز گم ہونے لگی۔ آخر ایک دن شانتی نے اپنے خاوند سے

کھٹن کر نلکے کی ٹونٹی پر لکڑی کا بکس لگوا اسے چھوٹا سا قفل چڑھا دیا اور اس کی چابی اپنے پاس رکھی۔

دوسرے دن جب وہ ایک ہی دھوتی سے بدن ڈھانپے پسینے سے تربتر چولھے کے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی تھی تو اُس نے اپنے سامنے ایک کالی سی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔

لڑکی اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا رنگ بے حد کالا تھا اور نہایت ہی میلی کچیلی دھوتی اور بنڈی پہنے ہوئے تھی۔ اپنے گھرے کالے بالوں میں شاید وہ سرسوں ہی کا تیل ڈالتی ہو گی۔ کیونکہ اس کی پیشانی پر بالوں کے نیچے پسینے کی وجہ سے تیل میں ملی ہوئی میل کی ایک لکیر سی بن گئی تھی ـــــ چوڑا سا منھ اور چپٹی سی ناک۔ گھن کے مارے شانتی کا گلا بھر آیا اور نفرت سے اس نے منھ پھیر لیا۔ آج تک گھر کی جمعدارن کے علاوہ نیچے رہنے والی نیچ ذات کی کسی لڑکی کو اوپر آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اور نہ خود ہی اس نے کسی سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

لڑکی مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ "کیا بات ہے۔" جیسے آنکھوں میں شانتی نے پوچھا۔

ذرا مسکراتے ہوئے لڑکی نے درخواست کی۔ "بی بی جی پانی لینا ہے۔"

"ہمارا نلکہ بھنگی چماروں کے لیے نہیں۔"

"ہم بھنگی ہیں نہ چمار۔"

"پھر کون ہو۔"

"میں بی بی جی سامنے کے مندر کے پجاری کی لڑکی......"
شانتی نے دھوتی سے چابی کھول کر اس کی طرف پھینک دی۔ زیادہ دیر تک اس کالی کلوٹی میلی کچیلی لڑکی کی باتیں سننا شانتی کو گوارا نہ تھا۔

....

لیکن اس سیاہ رنگ جسم میں دل کالا نہ تھا اور جلد ہی شانتی کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ گومتی روز، صبح شام چابی لینے آتی۔ گلی میں پوربیوں کا جو مندر تھا وہ اس کے پجاری کی لڑکی تھی۔ امیروں کے مندروں کے پجاری بھی موٹروں میں گھومتے ہیں۔ یہ مندر تھا غریب پوربیوں کا جن میں سے اکثر چوکیدار، چپراسی سائیس یا مزدور تھے۔ پجاری کا کنبہ بھی گلی کے ایک طرف بھنگیوں کی چارپائیوں کے سامنے سوتا تھا اور جب رات کو کوئی تانگہ اُدھر سے گذرتا تو اکثر کسی نہ کسی کی چارپائی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جاتی۔ مندر میں ایک کنواں تو تھا، لیکن جب سے اِدھر نلکے آئے اس پہ ڈول رسّی کبھی نہیں دیکھی گئی۔ جب نزدیک ہی کسی کی ڈیوڑھی یا سیڑھیوں کے نلکے سے پانی بہ آسانی مل جائے تو پھر کنوئیں پہ باہیں تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے گومتی اب ہر روز پانی لینے اور کچھ پانی لینے کے بہانے باتیں کرنے، صبح شام آجاتی۔ وہ اپنا ڈول جس میں پان کے دو ایک پتے ہمیشہ تیرا کرتے، نلکے کے نیچے رکھ کر، اوپر چلی آتی اور پھر باتوں باتوں میں بھول جاتی کہ وہ پانی لینے آئی ہے اور اس وقت تک نہ اُٹھتی، جب تک کہ اس کی بڑھیا دادی گلی میں اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے، اس کا نام لے لے کر کئی بار نہ چیختی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دوران میں شانتی اور گومتی آپس میں کچھ نزدیک آگئی تھیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب شانتی رسوئی میں کھانا پکاتی یا اندر کمرے میں بیٹھی کپڑے سیتی تو اُسے گومتی کا سیڑھیوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا بُرا نہ لگتا ——— کئی طرح کی باتیں ہوتیں۔ بھنگیوں کی باتیں چماروں کے گھریلو جھگڑوں کی باتیں۔ شرابی پوربیوں کی باتیں اور پھر خود گومتی کی اپنی باتیں اس دوران میں شانتی کو معلوم ہو گیا کہ گومتی کی شادی ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔ لیکن اس نے اپنے خاوند کی صورت تک نہیں دیکھی بیکار ہے، اس لیے نہ وہ اسے لینے آتا ہے اور نہ اس کے پتا اسے اس کے ساتھ بھیجتے ہیں۔

کئی بار چھیڑنے کی غرض سے اور کئی بار محض تفریح کے لیے شانتی اس سے اس کے خاوند کے متعلق کئی طرح کے "جذباتی" سوالات کرتی، جن کا جواب دیتے وقت، گومتی شرما جاتی تھی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی جگہ وہیں سیڑھیوں پر ہی تھی۔

. . . .

پھر کس طرح بچاری کی وہ کالی کلوٹی لڑکی وہاں سے اُٹھ کر اس کے اتنے نزدیک آگئی کہ شانتی نے ایک بار اسے بے ساختہ آغوش میں لے کر کہہ دیا آج سے تم میری بہن ہوئیں گومتی ——" یہ سب باتیں آج بھی شانتی کو اچھی طرح یاد تھیں۔

. . . .

سردیوں کی رات تھی اور انارکلی میں سب طرف دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے تمام ہوٹلوں، تندوروں کل کارخانوں
اور گھروں کے رسوئی خانوں سے دن بھر اُٹھتا رہنے والا دھواں اب ایک ہی
بار اکٹھا ہو کر انارکلی پر پل پڑا ہے۔ شانتی اپنے ننھے کو کندھے لگائے ہاتھوں میں
کچھ ہلکے پھلکے لفافے تھامے خرید و فروخت کر کے چلی آ رہی تھی۔ وہ کئی دن کے
اصرار کے بعد اپنے خاوند کو اس طرف لانے میں کامیاب ہوئی تھی اور اُنھوں نے
جی بھر کر چیزیں خریدی تھیں۔ انارکلی کے درمیان میں بنگالی رس گلوں کی جو دکان
ہے وہاں سے رس گلے کھانے کے لیے شانتی کا من بڑا مچلا کرتا تھا لیکن اس کے
خاوند کو کبھی اتنی فرصت نہ ہوئی تھی کہ وہاں تک صرف رس گلّے کھانے کے لیے
جا سکیں۔ ہسپتال روڈ کے سرے پر حلوائی کے ساتھ چاٹ والے کی جو دکان
ہے۔ اس کی چاٹ کا مزا چکھنے کو شانتی کا بڑا جی چاہتا تھا۔ لیکن چاٹ جیسی نکمی
چیز کے لیے دکان چھوڑ کر جانے کی فرصت شانتی کے شوہر کو کہاں تھی کئی دن سے
وہ اپنے امّی کے لیے کچھ گرم کپڑوں کے ٹکڑے خریدنا چاہتی تھی۔ سردی بڑھ رہی
تھی اور اُس کے پاس ایک بھی کوٹ نہ تھا۔ اور پھر گرم کپڑا نہ ہی اس کا خیال
تھا کہ کچھ اُون ہی لے لی جائے تاکہ ننھے کا سویٹر ہی بنا جا سکے۔ لیکن اس نے جب بھی
ان سے کہا، وہ ہاں ہوں کر کے ٹال گئے۔ اِس دن وہ ایک مہینے کے لگاتار اصرار
کے بعد انھیں اپنے ساتھ انارکلی لے جانے میں کامیاب ہوئی تھی اور اُس دن
اُنھوں نے جی بھر کر بنگالی کے رس گلے اور چاٹ والے کی چاٹ کھائی تھی۔ بلکہ
لگے ہاتھوں موہن کے پکوڑوں اور مٹر والے آلوؤں کا مزا بھی چکھا تھا۔ پھر امی کے لیے
کپڑا بھی خریدا تھا۔ اور اون بھی مول لی تھی۔ اس کے علاوہ چھ پیسے درجن والے

بلیڈ اور سکال گیٹ کپ سوپ کی ایک دو آنے کی ٹکیہ بھی خرید لی گئی تھی۔ کئی دن سے اس کے شوہر انہیں پرانے کند بلیڈوں کو شیشے کے گلاس میں تیز کر کر کے استعمال کر رہے تھے۔ اور روز نہانے والے صابن سے ہی حجامت بنائی جاتی تھی اور شانتی نے ان کے روکنے پر بھی یہ دونوں چیزیں زبردستی خرید لی تھیں۔ یہ سب کچھ لے کر دونوں خرچ کر سکنے کے احساس سے خوش خوش چلے آ رہے تھے۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور سوکھی سردی پڑ رہی تھی۔ شانتی نے اپنے سستے لیکن گرم شال کو ننھے کے اِرد گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا ”نگوڑا سوکھا جاڑا پڑ رہا ہے سنتی ہوں شہر میں بیماری پھیل رہی ہے“۔

لیکن اس کے پتی چپ چاپ اپنی دھوئیں کی تلخی سے نمدار آنکھوں کو ملتے رہے۔

شانتی نے پھر کہا۔ ”ہماری اپنی گلی میں کئی لوگ بیمار ہو گئے ہیں۔ پرسوں ٹینڈی چمار کا لڑکا نمونیا سے مر گیا“۔

اس وقت شال میں لپٹا ہوا بچہ دو بار آہستہ آہستہ کھانسا۔ شانتی نے اُسے اور بھی اچھی طرح شال میں لپیٹ لیا۔

اس کی بات کو سنی ان سنی کر کے اُس کے خاوند نے کہا: ”آج بے حد بدپرہیزی کی ہے۔ پیٹ میں ابھی سے گڑبڑ ہو رہی ہے۔

. . . . .

گھر آ کر جب شانتی نے لڑکے کو چارپائی پر لٹایا اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے اس کے بالوں کو ہٹایا تو وہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ سر کو ہاتھوں میں دبائے نالی پر بیٹھے تھے۔

"اُمی کا ماتھا تو توے کی طرح تپ رہا ہے" گلے کو بھر آنے سے روکتے ہوئے اُس نے کہا۔

لیکن اس کے خاوند کو قے ہوئی۔

شانتی کا حلق رکنے سا لگا تھا اور اس کی آنکھیں پرنم سی ہو گئی تھیں مگر اپنے خاوند کو قے کرتے دیکھ کر بچے کا خیال چھوڑ، وہ اُن کی طرف بھاگی پانی لا کر ان کو کلی کرائی۔ نڈھال ہو کر وہ چارپائی پر دراز ہو گئے۔ لیکن کچھ لمحے بعد انھیں پھر متلی ہوئی۔

شانتی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر میں وہ اکیلی تھی۔ ساس ماں پاس نہیں۔ کوئی دوسرا رشتہ دار بھی نزدیک نہیں اور نوکر رکھنے کی استطاعت کبھی ہوئی نہیں تھی۔ ایک اُڑی اُڑی سی نگاہ اس نے اپنے بخار سے تپتے ہوئے بچے اور بدہضمی سے نڈھال خاوند پر ڈالی۔ اچانک اُسے گومتی کا خیال آیا۔ شانتی کبھی تنہا گلی میں نہیں اتری تھی۔ لیکن بے جا شرم کو چھوڑ کر وہ بھاگی بھاگی گلی میں گئی۔ گومتی اپنی کوٹھری کے باہر گلی کی طرف اینٹوں کے ایک چھوٹے سے پردے کی اوٹ میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی اور آگ کی روشنی میں اس کا کالا چہرہ دمک رہا تھا۔ شانتی نے دیکھا، گومتی کا بڑا بھائی ابھی کھانا کھا کر اُٹھا ہے۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر اس نے گومتی کو بلایا۔ توے کو نیچے اُتار اور لکڑی کو باہر کھینچ کر گومتی اسی طرح بھاگی آئی۔ تب نہایت عجز سے شانتی نے مختصراً اپنی مصیبت کا

حال کہا اور اِس سے درخواست کی کہ اپنے بڑے بھائی کو بھیج کر فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوا دے۔ ان کی لانڈری کے پاس جس ڈاکٹر کی دکان ہے وہ سنا ہے، پاس ہی لاج روڈ پر رہتا ہے۔ اگر وہ آجائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ اور ساڑی کے پلو سے پانچ روپے کا ایک نوٹ کھول کر شانتی نے گومتی کے ہاتھ میں رکھ دیا اور کہا کہ فیس چاہے پہلے ہی کیوں نہ دینی پڑے لیکن بھائی سے کہنا کہ ڈاکٹر کو لے کر ضرور آئے۔ چلتے چلتے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ روٹی پکا کر اگر ممکن ہو تو تم بھی ذرا آجانا۔ اُمّی......

یہ کہتے کہتے شانتی کا گلا بھر آیا تھا۔ گومتی نے کہا تھا ـــــ "آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی بھائی کو بھیجے دیتی ہوں اور خود بھی ابھی آتی ہوں" اور یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔

شانتی واپس آئی تو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اِس نے محسوس کیا کہ فکر اور اندیشے سے اس کے پاؤں کانپ رہے ہیں اور اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔

اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ اس کے پتی کوٹھے پر سے اتر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی لوٹا ہے۔ چہرہ پہلے سے بھی زرد ہو گیا ہے اور ماتھے سے پسینہ چھوٹ رہا ہے۔

شانتی کے اُڑے ہوے رنگ کو دیکھ کر انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں، سردیوں میں ہیضہ نہیں ہوتا۔"

شانتی نے پہلے سہارا دے کر شوہر کو بستر پر لٹایا۔ پھر نالی پر پانی گرایا۔

اور پھر دوسرے کمرے میں بستر بچھا کر بچے کو اس پر لٹا آئی۔ اس وقت گومتی آ گئی کھانا تو سب کھا چکے تھے۔ اپنے حصّے کا آٹا اٹھا کے، آگ بجھا کر وہ جلدی سے آ گئی تھی۔

شانتی نے کہا، "اُمّی کو اُدھر کمرے میں لٹا آئی ہوں۔ مجھے ڈر ہے اسے سردی نہ لگ گئی ہو۔ سانس مشکل سے آتا ہے۔ اور کھانسی بڑھ گئی ہے۔ پچھلی کوٹھڑی میں پڑے ہوئے لحاف میں سے ذرا سا گوڈر لے آؤ اور انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر اس کی چھاتی کو روئی سے سینک دو۔ اِن کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ میں کچھ تدارک کرتی ہوں۔ کچھ نہیں تو گرم پانی کر کے بوتل ہی پھیرتی ہوں۔"

گومتی نے کہا، "بی بی جی۔ انھیں کوئی ہاضمے کی چیز دو۔ ہمارے گھر تُمّے کی اجوائن ہے۔ میں اس میں سے کچھ لیتی آئی ہوں۔ جب تک ڈاکٹر آئے ذرا گرم پانی سے وہی اُنھیں دے دو۔"

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شانتی نے میلی سی پڑیا میں بندھی ہوئی کالی سی اجوائن لے لی تھی اور گومتی انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر روئی لینے نیچے بھاگ گئی تھی۔

. . . .

باہر شام بڑھ چکی تھی۔ وہیں کمرے کے اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے شانتی کی آنکھوں میں اندیشوں اور فکر کے وہ سب دن رات پھر گئے۔ اس کے شوہر کو ہیضہ تو نہ تھا۔ لیکن بدہضمی سخت قسم کی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک گومتی کے کہنے پر شانتی نے انھیں تُمّے کی اجوائن دے دی تھی۔ پیاز بھی سنگھایا تھا اور گومتی انگیٹھی اُٹھا کر دوسرے کمرے میں بچے کے سینے کو روئی سے سینکنے کے لیے

چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے پر معلوم ہو گیا تھا کہ بچے کو نمونیا ہو گیا ہے۔ اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

خاوند اور بچّہ دونوں کی بہ یک وقت تیمار داری کرنا شانتی کے لیے نہایت مشکل تھا۔ اس نے مجبوری کے انداز میں گومتی کی طرف دیکھا تھا لیکن اُسے زبان ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی۔ بچے کی تیمار داری کا تمام بار گومتی نے اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ شانتی کو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کب گھر جاتی ہے؟ کب گھر والوں کو کھانا کھلاتی ہے اور خود کھاتی ہے یا کھاتی کھلاتی بھی ہے کہ نہیں اس نے تو جب دیکھا اُسے سائے کی طرح بچے کے پاس پایا۔ کئی دن تک ایک وقت ہی کھا کر اور کھانا پکانے کا کام اپنی بوڑھی دادی کو سونپ کر گومتی نے بچے کی تیمار داری کی تھی۔

- - - - - - - - - - - - - - - -

دوپہر کا وقت تھا۔ اس کے خاوند دکان پر گئے ہوئے تھے۔ اُمی کو بھی اب آرام تھا اور وہ چارپائی پر اس کی چھاتی سے لگا سو رہا تھا۔ پاس ہی فرش پر ٹاٹ بچھائے گومتی پرانے اون کے دھاگوں سے سوئیٹر بننا سیکھ رہی تھی اتنے دنوں کی تھکی ہاری نیند کی ماری شانتی کی پلکیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں وہ اُنھیں کھولتی تھی۔ لیکن وہ پھر بند ہو جاتی تھیں۔ آخر وہ اسی طرح پڑی پڑی سو گئی۔ جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا اُمّی رو رہا ہے اور گومتی اُسے بڑے پیار سے سریلی آواز میں تھپک کر لوری دے رہی ہے۔ شانتی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سنا گومتی آہستہ آہستہ گا رہی ہے۔

آری گگو، جا ری گگو جنگل پکو بیر
بھیّا ہاتھے ڈھیلا، چڑٹیا اڑے جا

اور پھر

آری چڑٹیا، دو پیڑا پکائے جا
بھیّا ہاتھے ڈھیلا، چڑٹیا اڑے جا

بچہ چپ کر گیا تھا۔ لوری ختم کر کے اس نے بچے کو گلے سے لگا کر چوم لیا شانتی کی نیم وا آنکھوں نے دیکھا بچے کے پیلے زرد سے چہرے پر گومتی کا صحت ور کالا منھ جھکا ہوا ہے۔ سکھ کے آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔ اس نے اُٹھ کر گومتی سے بچے کو لے لیا تھا اور جب وہ پھر ٹاٹ پر بیٹھنے لگی تھی تو دوسرے ہاتھ سے اس نے گومتی کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے اسے اپنے بازو سے باندھ لیا تھا اور کہا تھا ——— آج سے تم میری بہن ہوئیں گومتی

- - - - - - - - - -

آنکھیں بند کئے ہوئے شانتی ماضی کے انھیں مناظر میں گم تھی۔ اس کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو بہہ رہے تھے کہ اچانک اس کے شوہر اندر داخل ہوئے۔ کسی زمانے میں لانڈری کا کام کرنے والے اور وقت پڑنے پر خود اپنے ہاتھ سے استری گرم کر کے کپڑوں کو پریس کرنے میں بھی جھجک محسوس نہ کرنے والے لالہ دین دیال، اور لاہور کی مشہور فرم "دین دیال اینڈ سنز" کے مالک اور مشہور شیئر بروکر لالہ دین دیال میں بڑا بھاری فرق تھا۔ اس دس برس کے عرصے میں ان کے بال اگرچہ پک گئے تھے۔ لیکن جسم زیادہ موٹا ہو گیا تھا

اور لانڈری کے مالک ہونے پر بھی ڈھیلے ڈھالے اور میلے کپڑے پہننے کی جگہ اب
اُنھوں نے نہایت اعلیٰ ریشمی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں سفید ریشمی
جرابیں اور کالے ہلکے سینڈل پہنے ہوئے تھے۔

شانتی نے جھٹ رومال سے آنکھیں پونچھ لیں۔

بجلی کا بٹن دباتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ اندھیرے میں کیوں پڑی
ہو، اٹھو ذرا باہر باغ میں گھومو پھرو" اور پھر بولے "اندراتی کا فون آیا تھا کہ ہن اگر
چاہیں تو آج سینما دیکھا جائے"

"ہن" ــــ دل ہی دل میں شانتی غمگینی سے مسکرائی اور اس کے سامنے
ایک اور کالی کلوٹی سی لڑکی کی تصویر کھنچ گئی جسے کبھی اس نے ہن کہا تھا۔
لیکن بظاہر اس نے صرف اتنا کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں"

منھ پھلائے ہوئے لالہ دین دیال باہر چلے گئے۔

تب آنکھوں کو پھر ایک بار پونچھ کر اور قدرے چست ہو کر شانتی
میز کے پاس آئی اور کرسی پر بیٹھ کر پیڈ کو اپنی طرف کھسکا کر اس نے لکھا۔

ہن گومتی۔

تمھاری ہن اب بڑی بن گئی ہے۔ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ بڑے
آدمیوں کی بیویاں اب اس کی بہنیں ہیں پنجرے میں بند پنچھی کو کب اجازت
ہوتی ہے کہ آسمان پر اڑنے والے آزاد ہجولیوں سے مل سکے۔ میں نے
تمھیں پھر آنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اب تم کل نہ آنا۔ اپنی اس بے بس ہن کو
بھولنے کی کوشش کرنا۔ شانتی

اس بار اُس نے ایک سطر بھی نہیں کاٹی اور نہ کاغذ ہی پھاڑا۔ ہاں لکھتے لکھتے پھر آنکھیں بھر آنے سے جو ایک دو آنسوؤں کی بوندیں خط پر گریں۔ انھیں اُس نے سیاہی چوس سے سکھا دیا تھا۔ پھر خط کو لفافے میں بند کر کے اُس نے نوکر کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں لفافہ دے کر کہا کہ پوربیوں کی گلی میں مندر کے پجاری کی لڑکی گومتی کو دے آئے اور پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "گومتی کچھ ہی دن ہوئے، اپنے سُسرال سے آئی ہے۔"

نوکر خط لے کر چلا ہی تھا کہ شانتی نے اسے پھر آواز دی۔ اور خط اس کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ ڈالا۔ پھر آہستہ سے اس نے کہا۔ تم گومتی سے کہنا کہ بی بی جی اچانک آج میکے جا رہی ہیں اور دو مہینے تک واپس نہ آئیں گی۔

یہ کہہ کر وہ پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور آسمان سے اترتے ہوئے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔

بات اتنی ہی تھی کہ آج دوپہر کو جب وہ برج کھیل رہے تھے۔ تو نوکر نے آ کر خبر دی تھی کہ پوربیوں کی گلی والے پجاری کی لڑکی گومتی آئی ہے۔ یہ سنتے ہی، کھیل کو ادھورا چھوڑ کر اور یہ بھول کر کہ اس کے پارٹنر رائے صاحب لالہ بہاری لال ہیں، وہ بھاگ گئی تھی اور اس نے گومتی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا اور پھر وہ آپس میں دُکھ سکھ کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ شانتی کو معلوم ہو گیا تھا کہ جب گومتی کا شوہر کام کرنے لگا تو اُسے آگرے گیا تھا اور پھر ان دس سالوں میں وہ چار بچوں کی ماں بھی بن گئی تھی اور گومتی نے امّی کا اور دوسرے بچوں کا حال پوچھا تھا۔

اس دوران میں لالہ دین دیال کئی بار بلانے آئے تھے۔ لیکن وہ نہ گئی تھی اور جب دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ لے کر اس نے گومتی کو رخصت کیا تھا تو اس کے شوہر نے آکر کہا تھا۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس اجڈ اور گنوار عورت کے ساتھ اتنی دیر تک بیٹھی رہیں۔ تمہیں میری عزت کا ذرا بھی خیال نہ آیا اسے بغل میں لے کر اُن سب کے سامنے سے گذر گئیں۔ رائے صاحب اور ان کی بیوی ہنسنے لگے اور آخر انتظار کر کر کے چلے گئے......

اس کے بعد اس کے خاوند نے اور بہت کچھ کہا تھا۔ لیکن شانتی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ قفس کو قفس ہی سمجھے گی اور اڑنے کی کوشش نہ کرے گی۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

کرنیں

موجودہ دور کی خوفناک حقیقت پسندی جس افسانہ نگار سے رومان کی کیفیتیں نہیں چھین سکی۔ وہ شفیق الرحمن ہے۔ وہ حقایق سے اجتناب نہیں کرتا بلکہ اُن سے الجھتا ہے۔ ان سے ٹکراتا ہے۔ ان کا اپریشن کرتا ہے۔ مگر وہ اس الجھاؤ اور ٹکراؤ میں مسکراہٹوں کا خزینہ نہیں لٹاتا میٹھا تبسم کی زرفشاں لہریں اس کے ہر افسانے پر سیمابی انداز میں لرزتی رہتی ہیں وہ ہمیں زندگی سے بیزار نہیں کرتا۔ اس کے افسانے "زندگی زندہ رہنے کے لیے ہے" کے ہلکے پھلکے۔ سادہ سادہ۔ اور رنگ و نور سے بھرپور تجزیے ہیں۔

"کرنیں" میں شفیق الرحمن نے عذرا اور بھائی جان کی سیرتوں کا نہایت گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کی زبان میں شیرینی ہے، اور اس کا تفکر نہایت بے داغ ہے، وہ جو کچھ سوچتا ہے، کر دیتا ہے وہ ایک نوجوان موسیقار ہے، جو نغمے کے تال سر کو اصطلاحات کا غلام بنانے کے بجائے اپنے ذہن کی کروٹوں سے ہم آہنگ کرتا ہے، اور زندگی کی منھ توڑ دینے والی دشواریوں میں غیر محسوس طور پر نہیں کھیل کر جینے کا سبق دیتا اپنے مستقبل کے روشن افق کو چھونے کے لیے لپکا جا رہا ہے۔

جب لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میں نے اُن کی کوٹھی کا دروازہ طے کیا اور اکیلی سڑک پر چل دیا تو میرے سامنے دنیا اندھیر تھی۔ کوئی دل کو مسوس رہا تھا، میں گرا جا رہا تھا، کسی عمیق غار میں، میری روح پر نامرادی مسلط تھی، عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایک گہری دُھند نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ سہ پہر کا زرد سورج بڑی اداسی سے چمک رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے مٹیالے غبار نے دھوپ کو دھندلا کر دیا تھا، وہ راستہ کتنا تنہا تھا؟ کتنا بھیانک؟؟ —— ہوا کے گرم جھونکوں سے بگولے اُٹھ رہے تھے، سوکھے ہوئے پتے اُڑ رہے تھے۔

مجھے سن کر یقین بھی تھا اور نہیں بھی، اتنی جلدی میرے امیدوں کے محل کیونکر شکستہ ہو گئے، رنگین خواب ختم ہو گئے، میری آرزوؤں کا ستارہ غروب ہو گیا، بدنصیبی میرا کاشانہ بن گئی، اور اب زندہ رہنے کے لیے کچھ باقی نہ بچا۔

اگر یہی ہونا تھا تو میرے دل کی ویرانی نے پہلے ہی سے کیوں نہ بتا دیا —— چپکے سے سرگوشی کیوں نہ کر دی۔

ہوا کے گرم گرم جھونکے میرے بال پریشان کر رہے تھے، میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا پودوں کے نیچے پژمردہ پھول پڑے تھے، کچلے ہوئے پتے۔ سوکھی ٹہنیاں ہل رہی تھیں۔ مجھے غمگین روحوں کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، دُور کوئی پرندہ بڑی دردناک آوازیں نالہ و شیون کر رہا تھا۔ لُنڈ مُنڈ درخت کس قدر

وحشتناک دکھائی دے رہے تھے۔ پیلی پیلی دھوپ اور آسمان پر چھائے ہوئے گھرے غبار نے سارا ماحول کتنا غمگین بنا رکھا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے سنا کیا وہ سچ ہے، کیا وہ طرح طرح کے خواب واقعی پھیکے پڑ گئے، کیا وہ امیدیں جھوٹی تھیں —— وہ پیارے لمحے، چمکیلی صبحیں اور مسرت سے لبریز شامیں، تصور کے وہ رنگین جزیرے، پراسرار قصر!

میرے خدا! میں رنج والم کا یہ طوفان کیونکر برداشت کرسکوں گا، اب تو دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا، ایسی اجڑی ہوئی اُداس زندگی کو لے کر کیا کروں گا؟

کس قدر افسردگی میں میں گھر پہنچا، دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا، یہی جی چاہتا تھا کہ اب اندر نہ جاؤں بلکہ کہیں باہر نکل جاؤں اور پھر کبھی نہ لوٹوں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر اندر چلا گیا، باغیچے کے بڑے قطعے میں ننھے بہن بھائی کھیل رہے تھے، مسرت سے دمکتے ہوئے گلابی چہرے، شگفتہ باتیں —— کیسے کھلونے سے لگ رہے تھے؟

چبوترے پر رکھے ہوئے کوچ پر امّی بیٹھی کچھ بُن رہی تھیں، دل چاہا کہ دوڑ کر اُن کی گود میں سر رکھ دوں اور اس قدر روؤں کہ جی ہلکا ہو جائے، لیکن پھر خیال آیا کہ یہ زخم ایسا کاری ہے یوں مندمل نہ ہوگا۔ یونہی سوچتا رہا۔ خبطی سا، آوارہ سا، پاگلوں کی طرح سوچتا ہوا باغیچے میں چلا گیا، ایک اونچے سے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا، پھیکی دھوپ ٹہنیوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ کہیں دھوپ تھی کہیں سائے، ہلتی ہوئی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں اڑتے ہوئے سوکھے پتے —— کچلے ہوئے پھول —— ہوا کے جھونکوں کی سسکیاں، وہ شام کتنی ویران تھی۔ دنیا کس قدر اداس

معلوم ہو رہی تھی۔

پھر میں نے ایک درخت کے تنے پر ایک نام کھدا ہوا دیکھا۔ سوکھے ہوئے ہونٹ لرزنے لگے۔ دل میں امید کی ایک ننھی سی کرن ٹمٹمانے لگی۔ میں نے پاس جاکر پڑھا۔ لکھا تھا —— "شفو" —— ایک مرتبہ تو میں مسکرا ہی دیا بھیا شفو کا نام دیکھ کر۔

دیر تک میں اُن کے کھدے ہوئے نام کو دیکھتا رہا، اُن حروف کو جو انہوں نے خود لکھے تھے، نہ جانے کیا جادو تھا اس نام میں کیسی کیسی پرانی یادیں تازہ ہونے لگیں، میرا غم کتنا ہلکا ہو گیا، کچھ تسکین سی مل گئی۔ تصور میں وہ چمکیلے دن پھرنے لگے جو ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ میرے سامنے شفو بھیا کی جیتی جاگتی مورت آگئی۔

. . . .

انہیں باہر گئے ہوئے چند سال ہی گزرے ہونگے، مجھے ایک ایک بات یاد تھی —— لمبا قد، ترشا ہوا ورزشی جسم، گورے چٹے، کشادہ سینہ، مسکراتا ہوا چہرہ —— لبوں میں دبے ہوئے سگریٹ کا بل کھاتا ہوا دھواں، کتنی کشش تھی اس مسکراہٹ میں، جب چلتے تھے تو کیا شان ہوتی تھی، کیا وقار تھا، کتنے اچھے لگتے تھے۔ کیا مجال جو اتنی دیر کے لیے بھی اداس ہوتے ہوں، کسی نے کچھ بھی کہا لیکن بھیا مسکراتے رہیں گے، کہیں مایوسی ہوئی تو مسکرانے لگے۔ بڑی بُری خبر سُنتے اور مسکرا دیتے جہاں جاتے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے، میری آنکھوں کے سامنے وہ ساری تصویریں متحرک ہو گئیں، گذرے ہوئے واقعات یاد آ گئے، کئی سال پہلے کی یادیں تازہ ہو گئیں —— میرے بچپن کی۔

بھیا اُن دنوں ایف۔ ایس سی میں پڑھتے تھے، پڑھتے کیا تھے بس دو چار

گھنٹوں کے لیے کالج چلے جاتے تھے۔ بقیہ وقت کھیل کود اور سینما وغیرہ میں صرف ہوتا تھا۔ کالج میں ڈراما کر رہے ہیں، مباحثوں میں حصّہ لے رہے ہیں، ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جا پہنچے اور ایسی غزل سنائی کہ لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے، وہاں سے تمغہ ملا، ان کے کمرے میں چھوٹے بڑے ملا کر کل چالیس پچاس کپ رکھے تھے، بے شمار تمغے ـــــ رات گئے ہم کھڑکی میں بیٹھ کر ماؤتھ آرگن سنا کرتے، بھیا کا کمرہ میرے کمرے سے بالکل نزدیک تھا۔

سیٹی کتنی اچھی بجاتے تھے ـــــ کیسی شگفتہ سروں میں، صبح صبح سورج کی شعاعوں کے ساتھ ہمیں بھیا کی سیٹیاں سنائی دیتیں۔ ہم بچوں میں سے انھیں کوئی بھی ملتا تو جھٹ ہاتھ کے اشارے سے خود سلام کرتے اور پھر کیسے کیسے لطیفے سناتے۔

اپنے کالج میں کتنے مشہور تھے، کالج کے ہیرو تھے، سڑک پر جا رہے ہیں جو لڑکا ملتا ہے سلام کرتا ہے، ـــــ سب سے جان پہچان ہے۔ کالج میگزین دیکھو تو اس میں ان کا کئی جگہ ذکر ہے، کئی تصویریں ہیں، شہر میں کہیں میچ ہو رہا ہے۔ بھیا شفو ضرور کھیل رہے ہوں گے، ہر کھیل کو کتنی اچھی طرح کھیلتے تھے، تھے کتنے خوش قسمت ـــــ جس مقابلے میں شریک ہوئے جیت گئے، جو کچھ کہا وہی ہو گیا۔

انھیں چاندنی کتنی اچھی لگتی تھی، سردیوں میں اوور کوٹ پہنے باغیچے میں بیٹھے چاند کو تک رہے ہیں، پوچھا بھیا، یہ کیا کر رہے ہو، جواب میں مسکرا دیئے اور پیار کر دیا۔ رات کو سو رہے ہیں تو کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور چاندنی اندر آ رہی ہے

شام کو سب سے پہلے ستارے کو دیکھ کر دعا مانگتے۔ ہمیں بھی یہ خبط ہو گیا تھا، جہاں سورج غروب ہوا، اور سب کچھ چھوڑ کر تارے تلاش کرنے لگے۔

پھر مجھے آپا عذرا یاد آ گئیں، آپا ہم انھیں یونہی کہتے تھے، ہماری لگتی تو کچھ بھی نہ تھیں، ہمارے اُن کے کنبوں کی جان پہچان تھی، مدت کی واقفیت تھی۔ وہ بھیا شفو پر کتنی جان چھڑکتی تھیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گذرتا ہو جب وہ ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوں، بھیا صبح کالج جاتے وقت لمبا چکر کاٹتے تھے محض آپا عذرا کے لیے۔ جب وہ سکول کے لیے تیار ہوتیں تو ہمیشہ بھیا کا سائیکل اُن کی کوٹھی کے سامنے گذرتا، اور بھیا ہمیشہ وہاں کسی موٹر یا سائیکل سے ٹکراتے ٹکراتے بچتے۔

آپا عذرا کتنی پیاری تھیں، کتنی خوبصورت تھیں، دعوتوں، شادیوں اور دوسرے موقعوں پر بے شمار لڑکیوں کو دیکھا۔ لیکن اُن جیسی لڑکی کبھی نہ دیکھی، بچپن میں مجھے دو چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں، گلاب کی کلی اور رات کی رانی کی مہک، آپا عذرا کو دیکھ کر مجھے دونوں چیزیں یاد آ جاتیں، وہ کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتیں کتنی ملائمت تھی اُن کے لہجے میں۔ میں ضد کر کے انھیں گلابی دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور کرتا۔ کیونکہ اس طرح وہ بالکل گلاب کی کلی لگتی تھیں۔

پھولوں کے جھرمٹ میں بھیا شفو اور آپا عذرا دونوں بیٹھے ہیں۔ آپا بھیا کے بنائے ہوئے پھول پتوں کو کاڑھ رہی ہیں، بھیا رنگ بتاتے جا رہے ہیں اگر کہیں غلطی ہو گئی تو دونوں ہنس دیئے۔

دونوں ہنستے ہوئے کتنے معصوم لگتے تھے۔

پھر رات کو بھیا بیٹھے ہمیں لطیفے سنا رہے ہیں۔ یا کسی ناول کا کوئی دلچسپ حصّہ پڑھ رہے ہیں، اچٹ کر نگاہ ایک کونے میں چلی گئی، آپا عذرا ٹکٹکی باندھے بھیا کے چہرے کو دیکھ رہی ہیں، کیا مجال جو آنکھ ذرا جھپکتی ہو کتنی کتنی دیر یوں دیکھتی رہتیں۔

برج کھیلنے بیٹھتے تو آپا عذرا اور بھیا پارٹنر بن کر سب کو ہرا دیتے خوب جھگڑا ہوتا، بحث ہوتی کہ آخر تم دونوں نے پارٹنر بننے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ لیکن آپا عذرا اگر کھیلتیں تو بھیا شفو کی پارٹنر بن کر ورنہ ٹال مٹول کر جاتیں یہی حال بیڈمنٹن میں ہوتا۔

جب ہمارا اور اُن کا کنبہ پہاڑ پر گیا، تو ان دونوں نے ہمیں کیسی کیسی سیریں کرائیں پک نک ہوئے، ہمیں کتنا ہنسایا، رات کو کھانے پر بھیا کا انتظار ہو رہا ہے، اُدھر آپا کے ہاں شاید اُن کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہاں سمجھتے بھیا وہاں ہونگے اُدھر سمجھتے آپا عذرا ہمارے ہاں ہوں گی، رات چاندنی ہوتی میں سمجھ جاتا، وہ دونوں جھرنے کے پاس پتھروں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے۔

آپا عذرا چاندنی میں کتنی اچھی لگتیں، اُن دنوں ہمیں پریوں پر پورا عقیدہ تھا، ہم چاندنی میں اُنھیں پری سمجھتے جو رستہ بھول کر زمین پر رہ گئی ہو۔ شاید آپا عذرا کو بھی چاند دیکھنے کا اتنا ہی خبط تھا جتنا بھیا کو۔

بھیا پنسل سے کیسی اچھی تصویریں بناتے، جس کی تصویر بناتے اُس سے ہو بہو شکل مل جاتی، ہمارے کارٹون بنتے، لیکن زیادہ تر آپا عذرا کی تصویریں ہوتیں چھوٹی چھوٹی تصویروں کا انلارجمنٹ کرتے۔

ایک مرتبہ بھیا بیمار ہو گئے، آپا گھبرائی ہوئی ہمارے ہاں آئیں، سارا سارا

دن اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھی رہتیں، رات گئے واپس جاتیں، کتنی بے چین رہتی تھیں۔ اُنہی دنوں ایک رات کو میں بھیا کے کمرے میں گیا، آپا سرہانے بیٹھی تھیں، کھڑکی سے چاندنی اندر آ رہی تھی اور بھیا کے چہرے پر کھیل رہی تھی، کمرے میں رات کی رانی کی مہک تھی، آپا نے ہلکا ہلکا گلابی لباس پہن رکھا تھا، گڑیا لگ رہی تھیں۔ چاندنی میں اُن کے دوپٹے کا روپہلی پلّو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ شاید اُن کی آنکھوں میں دو ننھے موتی سے آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بھیا کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں، بیمار ہونے پر بھی بھیا حسب معمول مسکرا رہے تھے، میں سوچتا رہا کہ ہمیں سر میں ذرا سا درد ہو جائے تو طرح طرح کے منہ بناتے ہیں، اور بھیا ہیں کہ اُنھیں پرواہ ہی نہیں!

. . . .

آپا عذرا کے پاس اُن کے ابا کی کھینچی ہوئی تین چار بہت ہی اچھی تصویریں تھیں، بھیا شفو نے اُن کے لیے بڑی ضد کی۔ لیکن آپا نے نہ دیں، کہتیں کہ آپ اوروں کو دکھائیں گے، بھیا قسمیں کھاتے، ایک دن بولے لاؤ عہد نامہ لکھ کر دستخط کر دوں کہ کسی کو نہیں دکھاؤں گا، لیکن آپا نہ مانیں، بھیا نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا کہ تصویریں اُٹھا لاؤں۔ لیکن میں اپنی حماقت سے پکڑا گیا اور تصویریں نہیں ملیں، میں آپا عذرا سے خوب لڑا کہ آپ نے تو بھیا شفو کی درجنوں تصویریں رکھی ہوئی ہیں، البم میں، کتابوں میں، درازمیں، اپنے لاکٹ میں ـــــ اور انھیں اپنی ایک تصویر بھی نہیں دیتیں۔ ایک چاندنی رات کو میں آپا عذرا کو چھوڑنے جا رہا تھا، ہم دونوں باغ میں سے گذر رہے تھے کہ اتنے میں ہمیں شفو بھیا مل گئے، جو

کھیل کر واپس آرہے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ بھیا نے کالج کا بلیزر پہن رکھا تھا، گلے میں زردی مائل رنگ کا مفلر، ویسے ہی رنگ کی پتلون، کرکٹ کے جوتے۔ بال پریشان تھے، کتنے اچھے لگ رہے تھے، میں ایک طرف کو ہوگیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کیسے پیارے لگ رہے تھے، میں نے دل میں دعائیں مانگیں کہ خدا کرے یہ دونوں یونہی ہنستے کھیلتے اکٹھے چلا کریں۔

ایک چمکیلی صبح کو میں بھیا کے کمرے میں کچھ لینے گیا۔ دیکھا کہ ایک خوشنما ڈبہ گلابی ربن میں بندھا رکھا ہے، میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے شاید اُسے دیکھا ہی نہیں تھا، بولے پتہ نہیں، نہ جانے کون رکھ گیا ہے؟

اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک جگہ لکھا تھا "عذرا کی طرف سے، آپ کی سالگرہ پر" ہم جیسے چونک پڑے، آج اُن کی سالگرہ ہے کیا؟ بھیا کو خود پتہ نہیں تھا۔

اس دن بھیا کی سالگرہ منائی گئی، لیکن اگر آپا نہ بتاتیں تو کسی کو بھی پتہ نہ چلتا۔ شام کو آپا آئیں، میں مچل گیا کہ بتائیے آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ آج بھیا کی سالگرہ ہے، بولیں ڈائری میں لکھا تھا، میں نے کہا نہیں، بولیں ایک کتاب پر لکھا تھا۔ میری تسلی نہ ہوئی پوچھے گیا۔ آخر بولیں مجھے زبانی یاد تھا۔

بھیا ہر ہفتے نئی نئی کتابیں لاتے اور آپا عذرا کے ہاں بھجوا دیتے، ایک دن بہت سی کتابیں آپا واپس لائیں، ایک آسان سی کہانیوں کی کتاب میں اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا، اب جو پڑھتا ہوں تو ہر تیسرے چوتھے صفحے پر شفو بھیا کا نام لکھا ہے جہاں جہاں تصویریں ہیں، وہاں پھولوں میں درختوں پر، پتوں پر ———

چھپا چھپا کر لکھا ہوا ہے۔ میں سوچنے بیٹھ گیا، آپا عذرا ان کے نام کی تسبیح کرتی رہتی ہیں کیا؟

اُن دنوں بھیا کی قوتِ ارادی کتنی زبردست تھی، آپا نے کہہ دیا کہ اس میچ میں اتنی وکٹیں لو، بھیا نے جان توڑ کر بولنگ کی اور وکٹیں لے گئے کہہ دیا اتنی رنز کرو، باوجود بولر ہونے کے وہ رنز کر لیتے، ایک مرتبہ آپا نے کہا تھا کہ کسی مضمون میں اول آجاؤ تو جانیں، بھیا نے جو بری طرح محنت کی ہے تو سب کو گھبرا دیا، ڈاکٹری کے فرسٹ ایر میں ایک مضمون میں چوراسی نمبر لیے، کلاس میں اول آئے۔

ایک بات عجیب تھی، نہ جانے آپا کو کس طرح پتہ چل جاتا کہ آج بھیا خوش ہیں یا آج اُن کی طبیعت اچھی نہیں، اسی طرح بھیا بھی بتا دیتے، ایک دن کالج سے واپس آئے، آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے، میں کمرے میں دبکا ہوا اپنے میکینو کے سیٹ سے کھیل رہا تھا۔ بولے چلو ان کے ہاں چلتے ہیں میں ٹال مٹول کرنے لگا، بھیا کہنے لگے، ہمیں ضرور جانا چاہیے۔ اس وقت وہ اداس ہیں، پوچھا آپ کو کیونکر پتہ چلا، بولے۔ یونہی — میرا دل کہہ رہا ہے ہم وہاں گئے۔ دیکھا تو آپا عذرا سچ مچ اداس بیٹھی تھیں، کسی چھوٹے موٹے امتحان میں فیل ہو گئی ہوں گی یا نہ جانے کیا بات تھی، بھیا نے خوب مزیدار باتیں کیں، انہیں خوب ہنسایا۔

اُسی شام کو آپا عذرا ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں، ریڈیو سن رہے تھے ایک لمبے سے صوفے پر میں اور آپا بیٹھے تھے، بھیا شغو آئے، دو چار صوفے اور رکھے تھے۔ لیکن ان پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں، دو چار آپا کی سہیلیاں بھی تھیں اور کہیں جگہ نہ تھی بھیا میرے برابر بیٹھ گئے، کچھ کام تھا مجھے باہر جانا پڑا، جب میں واپس آیا تو دیکھتا ہوں کہ سب مسکرا رہے

ہیں۔ اور بھیا اور آپا کو دیکھ رہے ہیں، میں نے ایک خاتون سے چپکے سے پوچھا بات کیا ہے؟ اُنھوں نے ریڈیو کی طرف اشارہ کردیا پھر بھیا اور آپا عذرا کی طرف کوئی بہت اچھی طرح گا رہا تھا دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں۔ ایک تھا ؎

ہر لمحہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ! مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

آپا عذرا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، پہلے ہی گلابی تھیں، اب تو بالکل بیر بہوٹی بنی ہوئی تھیں، بھیا مسکرا رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں نیچی تھیں اور ماتھے پر پسینہ آیا ہوا تھا۔

دوسرا شعر تھا ؎

کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں
کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس شعر پر تو سب کے سب ایک دوسرے کی جانب اشارے کرنے لگے، آپا اور بھی سُرخ ہوگئیں، بھیا اتنے شرمائے کہ جلدی سے بہانہ کرکے باہر چلے گئے۔ اور ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

پھر یہ شعر کتنا چلا، بھیا اور آپا عذرا کو خوب چھیڑا گیا، آپا کی سہیلیوں نے آپا کا نام ہی رکھ دیا —— کہ "مجھ کو محبت ہے آپ سے"۔

ہمیں پتہ چلا کہ آپا کے کالج میں ڈراما ہوا اور بعینہٖ ہمارے گھر میں گذرتے ہوئے واقع کی نقل اتاری گئی۔

. . . .

ہمارے ہاں کوئی پارٹی تھی، رات کو ہم باغیچے میں بیٹھے تھے، امّی اور بزرگ خواتین اُٹھ کر اندر چلی گئیں، آپا عذرا، میں، بھیا شغو اور چند لڑکیاں باقی رہ گئے، چوتھی یا پانچوں کا پتلا چاند سرو کے درختوں میں سے جھانک رہا تھا، چھوٹی چھوٹی بدلیاں آسمان میں تیرتی پھر رہی تھیں۔ ہم پھولوں میں گھرے بیٹھے تھے، ہوا کے معطر جھونکے آرہے تھے۔ وہ بالکل ایسی رات تھی جیسی پریوں کی کہانیوں میں ہوا کرتی ہے۔

بھیا شغو بولے "میں نے ایک خواب دیکھا ـــــ" ہم سب متوجہ ہو گئے، بولے ـــــ "میں نے دیکھا کہ تیرہ و تاریک آسمان میں ایک پتلا سا چاند چمک رہا ہے، اس کی دونوں نوکیں پکڑے کوئی وہاں بیٹھا ہے، اور میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔"

ہم نے پوچھا۔ "وہ کون تھا؟" انھوں نے آپا عذرا کی طرف اشارہ کر دیا بولے "یہ تھیں" پھر بولے "جیسے انھوں نے مجھے اوپر آنے کو کہا۔ لیکن میں نہ پہنچ سکا کیونکہ یہ آسمان پر تھیں اور میں زمین پر۔ میں نے کہا تم مجھ سے بہت دُور ہو، انھوں نے مجھے دو چار مرتبہ بلایا، جب میں تھک کر بیٹھ گیا تو یہ کھلکھلا کر ہنس دیں، بولیں آپ یہاں ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ میں آپ سے بہت دور ہوں ـــــ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی ـــــ!"

ہم سب ہنس پڑے، بھیا کو بھی کیا بچوں جیسے خواب نظر آتے ہیں، ایسے خواب تو ہمیں دکھائی دینے چاہئیں، لیکن آپا عذرا سنجیدہ رہیں، انھوں نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس خواب کو پہلے سے جانتی ہوں، یا انھوں نے بھی یہی خواب دیکھا ہو، پھر دیر تک ہم پھولوں میں گھرے ہوئے، چمکیلے چاند کے نیچے بیٹھے پریوں کے متعلق باتیں

کرتے رہے۔

کئی دنوں کے بعد ہم پھر اُسی جگہ بیٹھے تھے، اندھیری رات تھی، آپا اپنی کار کا انتظار کر رہی تھیں، پھولدار بیلوں میں ایک چھوٹا سا بجلی کا قمقمہ لگا ہوا تھا ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی، ہم ایک چھوٹے سے ڈرامے کی باتیں کر رہے تھے جسے سٹیج کرنے کا ارادہ تھا۔

یکایک بھیا بولے "اگر کہو تو ایک خواب سناؤں؟" ہم سب بولے ——

"ضرور"۔

کہنے لگے کل رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ایک اُجاڑ میدان ہے، کالے کالے پتھر کھڑے ہیں۔ آسمان پر مٹیالا غبار چھایا ہوا ہے، میں چلا جا رہا ہوں، بڑے وحشتناک راستے کو عبور کرنے کے بعد میں ایک ٹوٹے پھوٹے قلعے کے دروازے پر پہنچا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اداسی تھی —— کچھ عجیب سی مورتیں چپ چاپ اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں، کوئی مجھے قلعے کے اندر لے گیا۔ اندر مجھے شعلے نظر آئے، سسکیاں سنائی دیں، ایک پیچیدہ راستہ طے کر کے میں ایک میدان میں پہنچا۔ یہاں بڑا ہجوم تھا، ایک اونچے سے ٹیلے پر کوئی کھڑا تھا —— بڑا غمگین ——؟"

"کون کھڑا تھا؟" ہم سب پوچھنے لگے۔

"یہ تھیں!" اُنھوں نے آپا عذرا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ہم نے آپا کو دیکھا اُن کے چہرے پر کتنی اُداسی تھی۔

وہ بولیں "اس کے بعد میں بتاؤں کہ کیا ہوا؟"

ہم حیران رہ گئے کیا ایک ہی خواب ان دونوں کو نظر آیا تھا۔

وہ کہنے لگیں "پھر انھوں نے چاہا کہ میرے پاس آجائیں، اور مجھے وہاں سے باہر نکال لیں، لیکن یہ بالکل بول نہ سکے۔ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے، دیر تک یہ یونہی کھڑے تکتے رہے، اس کے بعد ایک آندھی آئی ـــــ اور ـــــ "؟

"تمھیں کیا پتہ؟" بھیا تعجب سے بولے۔

"یہی خواب رات میں نے دیکھا تھا"۔

"عجیب بات ہے!" ـــــ بھیا بولے۔

ہم سب خاموش ہو گئے، اس اندھیری رات میں ہم ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے نیچے دیر تک بیٹھے اس خواب کے متعلق سوچتے رہے، ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی تارے ٹوٹے۔ چاروں طرف خاموشی تھی ـــــ درختوں سے کبھی کبھی پرندے کی آواز آجاتی ـــــ فوارے کی دھیمی دھیمی صدا ہمیں چونکا رہی تھی۔ اس رات مجھے بڑا ڈر لگا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں اور چچا ابا ہمیں اپنے ساتھ پہاڑ پر لے گئے، آپا عذرا ہمیں بہت یاد آئیں۔ بھیا شفو ہمیں سارے دن سیر کراتے ایک نِک ہوتے، بوٹنگ کرتے، جھیلوں میں تیرتے، مچھلیاں پکڑتے ـــــ تصویریں اتاری جاتیں، غرضیکہ وہ دن بڑی دلچسپی سے گزر رہے تھے، ہم بعض اوقات تو چاندنی راتوں میں صبح تک باہر پھرتے رہے، بھیا ماؤتھ آرگن پر کوئی سُر بجا رہے ہیں اور ہم ان کے ساتھ مارچ کر رہے ہیں۔

ایک دن دیکھتے ہیں کہ بھیا واپس جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں وجہ

پوچھی تو بولے —— یونہی جی چاہتا ہے کہ واپس چلیں۔

جب وہ جانے لگے تو میں مچل گیا کہ دراصل وجہ کیا ہے آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟

چلتے چلتے بولے "کسی کو بتانا مت۔ مجھے رات ایک بہت ڈراؤنا خواب دکھائی دیا ہے —— !"

"آپا عذرا کے متعلق ——؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

جب وہ چلے گئے تو ہم سب اداس ہو گئے، نہ کوئی صبح صبح سیٹیاں بجاتا نہ ہمیں قوس و قزح اچھی لگتی نہ شفق، نہ ہمیں کوئی سیر کو لے جاتا۔

دو ہفتوں کے بعد ایک بہت بُری خبر سنی —— آپا عذرا کی شادی ہو رہی تھی —— بھیا شفو سے نہیں کسی اور سے۔

ہمیں بالکل یقین نہ آیا جب چچا ابا نے کہا کہ سچ مچ ہو رہی ہے۔ تب ہم کتنے روئے، مجھے بخار چڑھ گیا، ہم سب بچوں نے چچا ابا کی کتنی منتیں کیں کہ وہ آپا عذرا کے ابا سے ملیں، اور بھیا شفو سے شادی کے لیے کہہ دیں۔ انھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ بولے "ابھی شفو لڑکا ہی تو ہے، جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔"

ہم ان سے روٹھ گئے۔ میں ہر وقت دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ ساری ساری رات رویا کرتا۔ اگلے مہینے ہم واپس گئے، بھیا ہمیں ملے" وہ کتنے زرد ہو گئے تھے۔ کیسے دُبلے لگ رہے تھے جیسے بیمار ہوں۔ لیکن انھوں نے نہ کسی کی شکایت کی، نہ وہ رنجیدہ ہوئے۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ بدستور تھی۔ چاند کو تکنے کا خبط پہلے سے انہیں زیادہ

ہو گیا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد آپا کی شادی ہونی تھی، آپا اب ہمارے ہاں نہیں آتی تھیں، ایک دن اُنھوں نے مجھے بلایا، اور ایک خط دیا، بولیں اپنے بھیا کو دینا۔ اور جواب کی تاکید کی۔ اُن کے ہونٹ لرز رہے تھے، آنکھیں پرنم تھیں ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں نے خط بھیا کو دیا، اور جواب مانگا، بھیا نے ایک کتاب میں سے ایک صفحہ کاٹ کر مجھے دیدیا، انگریزی کی کوئی نظم تھی۔ دو تین سال کے بعد جب میں نے اپنے کورس میں وہی نظم پڑھی تو کتنی اچھی لگی، میں نے اس نظم کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ زبانی یاد ہو گئی، تب مجھے پتہ چلا کہ بھیا نے خط کے جواب میں وہ نظم کیوں بھیجی تھی ——— نظم یہ تھی ——— "جب تم عمر رسیدہ ہو جاؤ، یہ ریشم کے لچھوں جیسے بال یوں چمکنے لگیں جیسے چاندی کے تار، یہ حسین کٹورے سی آنکھیں دھندلی پڑ جائیں اس چاند سی پیشانی پر وقت جھریاں ڈال دے جب کبھی اپنے کنبے میں بیٹھی انھیں نصیحتیں کر رہی ہو، تب کبھی سوچنا کہ تمھاری آنکھوں میں کتنی ملائمت تھی، کتنا سحر تھا، سنہرے بالوں کی پریشان لٹیں تمھارے دمکتے ہوئے چہرے پر کتنی اچھی لگتی تھیں تمھاری مسکراہٹ کتنی دلفریب تھی، تم کتنی خوبصورت تھیں، تم فرشتوں کا تخیل تھیں، حوروں کا خواب تھیں ——— اس وقت ایک بدنصیب کو بھی یاد کرنا۔ جو تمھارا پرستار تھا۔ جو تمھارا نام لے لے کر جیتا رہا، جس نے اس حسین مجسمے کی حسین روح کو چاہا ——— کتنے خوش گوار تھے وہ لمحے جو اُس نے تمھارے پاس گذارے ———
پھر یاد کرنا کہ محبت کتنی حسین چیز تھی جو افق کے اس طرف طلوع ہوئی جس سے

زمین و آسمان سب کچھ جگمگا اُٹھا —— پھر افق کے اس طرف چلی گئی اور تاروں کے کسی جھرمٹ میں اپنا منھ چھپا لیا۔" آپا عذرا یہ نظم پڑھ کر کتنی روئی تھیں، اس سے پہلے وہ میرے سامنے کبھی نہیں روئیں، لیکن اس دن تو جیسے آنسوؤں پر اُن کا قابو نہ رہا۔ اس صفحے کو تہ کر کے اپنے لاکٹ میں رکھ لیا۔

. . . .

آپا عذرا کی شادی ہوئی —— ایک ٹھگنے سے صاحب کے ساتھ جو سانولے بھی تھے اور عمر میں بھی بڑے تھے —— کچھ موٹے بھی تھے۔ ہمیں وہ ذرا نہ بھائے۔ البتہ سنا تھا کہ آپا عذرا کے ابا کو وہ بہت اچھے لگتے تھے۔ بھیا شفو اُن سے بڑے گھل مل کر باتیں کرتے رہے، انھیں اپنے ہاں بھی لائے، اپنی لائبریری دکھائی۔ سارے البم دکھائے۔ اکٹھے سینما گئے۔ پھر شادی میں بھیا کتنی گرمجوشی سے کام کرتے رہے، اندر باہر ہر جگہ بھیا انتظام کرتے پھر رہے ہیں، ہم سب حیران تھے کہ بھیا کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں ان پر غم کا اثر ہی نہیں ہوتا، ان کا دل کتنا وسیع ہے۔ جہاں رنج و الم سب سما جاتے ہیں اور چہرے پر اداسی کی لہر تک نہیں آتی۔ اور بدستور مسکراتے رہتے ہیں۔

دولہا میاں کے اصرار پر بھیا کو اور مجھے چند سٹیشن ساتھ جانا پڑا۔ برابر کے ڈبے میں آپا عذرا تھیں، بھیا شفو کھڑکی میں بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں، ٹرین بڑی تیزی سے جا رہی تھی، باہر گرد و غبار کا طوفان تھا، لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ جانے آپا عذرا کی آنکھوں میں دھواں چلا گیا تھا یا کوئلے کا ذرہ ——

اُن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھیں۔ کتنی بے کسی تھی اُن آنکھوں میں، کتنا درد تھا؟ —— میں بے چین ہو گیا۔

- - - - - - - -

اس کے بعد بھیا کی قسمت پلٹ گئی، وہ ہر جگہ پیچھے رہنے لگے۔ ہر مقابلے میں ہارنے لگے، جن جن کھیلوں کے وہ اتنے اچھے کھلاڑی تھے۔ اُن میں ایسے پھسڈی ہو گئے کہ سب حیران رہ گئے۔ جیسے اُن میں قوتِ ارادی باقی نہ رہی ہر جدوجہد میں رہ جاتے، جو کام شروع کرتے وہ بیچ میں چھوڑنا پڑتا، بڑی محنت کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ اب بھیا تھے اور متواتر ناکامیاں، مایوسیاں رنج والم کے طوفان —— ؟

ہم روز سنا کرتے آج بھیا مکہ بازی میں ہار گئے۔ آج کرکٹ میں یونہی آؤٹ ہو گئے، آج بوٹنگ فضول کی، وہی ڈاکٹری جس میں بھیا پہلے بڑے اچھے نمبر لیتے تھے فورتھ ایر میں فیل ہوتے ہوئے بچے۔ مریضوں کا انھیں ایسا خبط تھا کہ صبح شام ہسپتال بھاگے جا رہے ہیں مریضوں کو ہنسائیں گے۔ اُن کے لیے تحفے لے کر جائیں گے، کیا اب نہ کالج کی پرواہ تھی نہ ہسپتال، سارا سارا دن غائب رہتے، اکیلے دریا پر گئے ہوئے ہیں، کشتی چلا رہے ہیں۔ اکیلے باغوں میں گھوم رہے ہیں اُن کے کمرے میں رات کو دیر تک روشنی رہتی، پڑھائی کم کر دی تھی فلمیں بہت دیکھنے لگے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اُن کی شگفتگی بدستور تھی۔ صبح صبح اُن کی سیٹیاں برابر سنائی دیتیں، ہمیں سلام بھی کرتے، ماؤتھ آرگن سناتے، تصویریں اتارتے، ہمارے ساتھ خوب کھیلتے۔

پھر اُن کا ڈاکٹری کا آخری امتحان ہوا، ہم سنا کرتے تھے کہ بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بھیا نے بڑی بے دلی سے تیاری کی، کتاب سامنے رکھی ہے، نگاہیں کھڑکی میں سے باہر افق پر جمی ہوئی ہیں، کبھی کبھی مسکرا کر سیٹی بجا دی اور پھر باہر دیکھنے لگے۔

امتحان ہوا، نتیجہ سنا تو ہم دم بخود رہ گئے، بھیا فیل ہو گئے ------ آج تک کسی چھوٹے سے امتحان میں بھی فیل نہ ہوئے، اتنا اچھا ریکارڈ تھا، اتنے اچھے طالب علم تھے، پہلی مرتبہ فیل ہوئے تھے۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا، ہمارے پڑوس کی کوٹھی میں ایک لڑکی بھیا کو پسند کرنے لگی، نہ جانے کب سے انھیں چھپ چھپ کر دیکھتی تھی، بیچاری نے کیسے جتن کیے، کن کن بہانوں سے بھیا سے ملی، مجھے تنگ کر دیا، جب وہاں سے گذرنا پکڑ لیتی، دیر تک بٹھائے بھیا کی باتیں پوچھتی رہتی، زبانی پیغام بھیجے، خط بھیجے اپنی تصویریں بھیجیں۔ میں بہتیرا انکار کرتا۔ لیکن اس کے سامنے ایک نہ چلتی بیچاری اتنی بری بھی نہ تھی، شمیم یا نسیم کچھ ایسا ہی نام تھا ------ مجھے کبھی اچھی نہ لگی، بھیا نے کبھی اُس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ اُس کے تحفے قبول نہیں کیے ایک دفعہ تو اُس نے بھیا کا راستہ روک لیا۔ اور بڑی بے کسی سے پوچھا "آپ میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟" بھیا مسکرا کر ٹال مٹول کر گئے۔

بعد میں تو مجھے بیچاری پر ترس آنے لگا، پھر اُس کے ابا کا تبادلہ ہو گیا۔ چلتے وقت اُس نے بڑی منتوں سے بھیا کو بلایا، بڑی التجا سے، وہ ملنے گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہ ایک برسات کی اندھیری رات تھی، بارش ابھی ابھی تھمی تھی،

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ دیر تک بھیا کے سامنے کھڑی روتی رہی، بھیا سے رومال مانگا جو انھوں نے دیدیا اگلے روز وہ بیچاری چلی گئی، اس کے چند خط بھی آئے۔ لیکن کسی کا جواب نہیں دیا گیا، پھر کوئی خط نہ آیا۔

. . . .

بھیا بیمار ہو گئے، دن بھر ان کے کمرے میں جمگھٹا لگا رہتا، کیسی کیسی نازبرداریاں کی جاتیں۔ رات کو میں ان کے کمرے میں گیا، مدھم سی روشنی ہو رہی تھی، کھڑکیاں بند تھیں، دفعتاً مجھے خیال آیا کہ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے میں نے وہ روشنی بجھا کر کھڑکیاں کھول دیں، بھیا کے چہرے پر چاندنی آگئی ـــــ وہ کیسے خوش ہوئے، پوچھا کون ہے؟ میں پاس جا کھڑا ہوا انھوں نے مجھے کتنا پیار کیا۔ اور کیسی اچھی اچھی باتیں کیں، وہ چاند کو تکتے رہے، ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی، نہ جانے وہ کونسی کھوئی ہوئی جنت کی جھلک دیکھ رہے تھے؟ وہ کون سے خواب تھے جو چاندنی میں جھلملا رہے تھے، انھیں کیا یاد آ رہا تھا؟

جب اچھے ہوئے تو ایک پارٹی دی گئی۔ ہمارے ہاں بڑی رونق تھی چند خواتین بڑی دور سے آئی تھیں۔ اسی کمرے میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے، بھیا اور میں اسی صوفے پر بیٹھے تھے۔ ایک خاتون بھیا سے بولیں "میاں ـــــ وہ شعر تمہیں یاد ہے نا؟"

یہ بولے "کونسا؟"

بولیں ـــــ "وہی ـــــ کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے" ـــــ

میں پریشان ہوگیا۔

بھیا مسکرا کر بولے "ہاں یاد ہے!"

وہ بولیں "وہ شعر والی محترمہ اب کیسی ہیں؟"

مجھ پر گویا بجلی گر پڑی، سوچنے لگا اب بھیا کیا جواب دیں گے، لیکن وہ بدستور مسکراتے رہے بولے "اب وہ کہیں اور چلی گئیں ——!"

وہ بولیں "اور کہاں جا سکتی ہیں بھلا — ؟"

یہ بولے "اُن کی شادی ہوگئی" —— وہ بیچاری دن بھر کیسی چپ چاپ رہیں۔

چند دنوں کے بعد بھیا کی سالگرہ تھی، صبح صبح بھیا کے نام ایک لفافہ آیا گلابی رنگ کا، جس میں رات کی رانی کی مہک تھی، میں نے جھٹ پہچان لیا طرزِ تحریر آپا عذرا کا تھا۔ کھول کر دیکھا تو وہی تین تصویریں تھیں، نہ کوئی خط تھا، نہ اُن تصویروں پر کچھ لکھا تھا۔

میں کتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا، کہ پہلے تو اتنی کوششوں پر بھی یہ تصویریں بھیا کو نہ مل سکیں۔ اور اب کتنی آسانی سے مل گئیں۔

- - - - - - - - - - - - - -

ہسپتال میں کسی مریض کے لیے بہت سے خون کی ضرورت تھی، اتنا خون کہ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بھیا چپکے سے جا کر خون دے آئے واپس آئے بازو میں پٹی بندھی ہے، چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ مسکراتے ہوئے آ رہے ہیں۔

بھیا نے دوسری مرتبہ ڈاکٹری کا امتحان دیا، ہمیں اُمید تھی کہ اس مرتبہ

ضرور کامیاب ہو جائیں گے، وہ پھر فیل ہو گئے۔ ان ناکامیوں پر ہمیں یقین ہی نہ آتا تھا یہ تو اتنے خوش قسمت تھے کہ جب بغیر پڑھے امتحان میں بیٹھتے تھے تو پاس ہو جاتے تھے اور اب یہی ہیں کہ محنت کرنے پر بھی رہ جاتے ہیں۔ کئی روز تک گھر میں سب اداس رہے۔

ایک دن آپا عذرا کا میرے نام خط آیا، وہ کہیں جا رہی تھیں، ان کی ٹرین ہمارے سٹیشن پر آدھ گھنٹہ ٹھہرتی تھی۔ لکھا تھا مجھے آکر ملو، ٹرین کے وقت سے پہلے میں اور بھیا شفو موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ آدھی دور جا کر ایک اجاڑ سی جگہ موٹر سائیکل بگڑ گیا، پہلے خود کوشش کی، پھر اُسے کھینچ کر مرمت کے لیے لے گئے، وہاں انتظار کرنا پڑا، معلوم ہوا ابھی دیر لگے گی۔ ایسا اتفاق ہوا کہ سڑک پر نہ موٹر ملی نہ کوئی تانگہ، آخر پیدل بھاگے، جب پلیٹ فارم پر پہنچے تو اُن کی ٹرین آہستہ آہستہ جا رہی تھی، ہم نے بڑی کوشش کی کہ آپا عذرا کو کہیں دیکھ لیں، لیکن نہ دیکھ سکے۔ میرا جی بھر آیا، چاہا کہ پھوٹ پھوٹ روؤں، ایک بنچ پر بیٹھ کر رومال سے آنسو پونچھنے لگا، بھیا نے میرا ہاتھ پکڑا اور سٹال پر لے گئے۔ وہاں مجھے چاکلیٹ، ٹافی اور نہ جانے کیسی کیسی چیزیں لے دیں۔ اور پھر ہنساتے ہوئے واپس لے آئے۔

اگلے مہینے میرا امتحان ختم ہوا اور میں امی کو چھوڑنے چلا گیا، ایک سٹیشن پر آپا عذرا مل گئیں، اپنے شوہر کے ساتھ تھیں۔ وہ کہیں سے واپس آ رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کیا یہ وہی آپا عذرا ہیں ——؟ کتنی دُبلی پتلی اور غمزدہ نظر آ رہی تھیں، جیسے برسوں کی بیمار ہوں، جن ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی تھی اب وہ کتنے افسردہ لگ رہے تھے۔ چہرے کی چمک دمک اب کہاں

چلی گئی تھی؟" انھوں نے مجھے بہت پیار کیا بڑی اچھی اچھی باتیں کرتی رہیں۔ ایک گھنٹہ تک ہم اکٹھے رہے۔ کئی مہینے میں امی کے ساتھ رہا۔ بھیا مجھے یاد آتے، ایک دن پتہ چلا کہ بھیا پاس ہو گئے۔ اب وہ ڈاکٹر بن گئے تھے۔ میں امی کو ساتھ لے کر سیدھا گھر بھاگا بھیا کو مبارکباد دی۔ ہمیں خوشی ہوئی۔ اس کے بعد کئی مہینوں تک بھیا کے مستقبل کے پروگرام بنائے گئے۔ ان کی شادی کے لیے زور دیا گیا امی، ابا، چچا ابا ـــــ سارے بزرگ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔ بیسیوں جگہ سے پیغام آئے لیکن بھیا انکار ہی کرتے رہے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ابا نے بھیا سے پوچھا "تو آخر تمھارا ارادہ کیا ہے؟ کیا عمر بھر کنوارے رہو گے؟"

بھیا بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر بولے "دیکھیے نا جہاں کنبے میں سب کے سب ذمہ دار اور عقلمند ہوں وہاں ایک مجھ سا پگلا بھی ہونا چاہیے۔ جسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے"۔

سب ہنس پڑے۔

بزرگوں کے بنائے ہوئے پروگرام یونہی دھرے رہ گئے اور ایک اداس سی سہ پہر کو بھیا ہم سے کئی ہزار میل دور چلے گئے۔ ہی اپی میں یا شاید وہاں سے بھی آگے۔ اپنے کسی دوست کے ساتھ۔

وہ وہاں ڈاکٹر لگ گئے۔ ہم سب مہینوں تک انھیں یاد کرتے رہے سارا کنبہ ان کے لیے اداس رہا، دعائیں مانگیں کہ وہ واپس آجائیں اور یہیں رہیں۔ سال بھر کے بعد وہ واپس آئے، اب تک اکیلے ہی تھے۔ چند روز ٹھہر کر واپس چلے گئے۔

اُن کے خط آیا کرتے تھے، جن میں وہی شوخیاں ہوتیں، وہی شگفتگی؛ میں اپنے سالانہ امتحان میں منہمک ہو گیا۔ گرمیوں میں پہاڑوں پر پھرتا رہا، ذہن میں اُن کی تصویریں دھندلی پڑتی گئیں۔

آہستہ آہستہ اُن کی باتیں ہمارے دلوں سے اترتی گئیں۔ آپا عذرا کو دیکھے بھی مدت گزر گئی۔ کبھی دوسرے تیسرے مہینے بھیا کا خط آیا تو ذرا دیر کے لیے ہنس لیے بس!

لیکن اُن کی مسکراہٹ ہمیشہ میرے لیے رہنما بنی رہی۔ صبح صبح مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی باغ میں سیٹیاں بجا رہا ہو۔ ویسی ہی شگفتہ سُروں میں اُن کی تصویریں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتا۔

- - - - - - - - - -

میں نے درخت پر کھدے ہوئے نام کو دیکھا مجھے شفو بھیا کتنے قریب محسوس ہوئے، جیسے میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہوں، مجھے کتنی تسکین ہوئی کسی نے دل کے زخم پر پھایا رکھ دیا ـــــ جیسے طوفان زدہ اندھیری رات میں کوئی مسافر حوصلہ ہارنے کو ہو اور یکایک تیرہ و تاریک آسمان پر کسی بدلی کی اوٹ سے ایک چمکیلا تارہ جھانکنے لگے، اور مسافر کسی نامعلوم اُمید پر پھر جد و جہد شروع کر دے۔ شفو بھیا کا دل کیسا تھا؟ جو نہ غموں سے جھکا، نہ آفتوں نے اس پر کوئی اثر کیا، یوں کے کیسے کیسے طوفان آئے۔ لیکن اُسے نہ ہلا سکے۔

وہ معصوم سا چہرہ، لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، سگریٹ کا بل کھاتا ہوا دھواں۔ جب آتے تھے تو گویا کرنیں ساتھ آتی تھیں، عجیب عجیب سُر تیں ساتھ

لاتے تھے۔ وہ پیاری سی مسکراہٹ ہمارے لیے ایک نعمت تھی۔

اور اب! ـــــ اب بھی اُن کی وہی اجاڑ اور بھیانک زندگی ہوگی ـــــ تنہا زندگی! اب بھی وہ ہر روز نئی نئی ناکامیوں کا منہ دیکھتے ہوں گے، لیکن اُن کا چہرہ اب بھی روشن ہوگا، شکایت کا ایک لفظ بھی اُن کے لبوں پر نہ آتا ہوگا مریضوں کا آدھا دکھ تو وہ اپنی میٹھی باتوں سے دور کر دیتے ہوں گے۔ رنگ برنگ پھولوں کا اب بھی شوق ہوگا، باغ میں اب بھی صبح صبح سیٹیاں بجاتے ہوں گے چاند کو دیکھنے کا خبط شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہوگا۔

بھیا شفو کی یاد میرے دل میں یوں تیر رہی تھی، جیسے پانی کی سطح پر تیرتا ہوا کنول کا پھول ہوا کے جھونکوں سے رقص کرنے لگے۔

جب میں چونکا تو چاروں طرف کچھ تاریکی سی تھی، کچھ اجالا سا تھا، ـــــ یا یوں کہ دونوں ملے جلے سے!

نیا نیا نکلا ہوا چاند۔ یاسمین کی لہراتی ہوئی ٹہنیوں سے جھانک رہا تھا۔ سوکھی ہوئی ٹہنیوں پر بے شمار نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہوا کے خنک جھونکوں میں عجیب سی خوشبو تھی ـــــ نامعلوم سی خوشبو! رات کی رانی اور شبو کے پودے جھوم رہے تھے۔

آسمان پر ننھے ننھے تاروں کا غبار تھا ـــــ ٹمٹماتے ہوئے تاروں کا دھندلا سا

غبار۔ چاند کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بدلیاں تیر رہی تھیں۔

فوارے کی ہلکی ترنم خیز صدا کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

میں مسکرانے لگا ——— عجیب سی مسرت میرے دل میں کروٹیں لینے لگی۔ میں بالکل نئی فضا میں سانس لے رہا تھا۔

تب میں نے سوچا کہ یہ رنج و غم سب وقتی چیزیں ہیں ——— بالکل ناپائیدار! ——— نہ تو خوشی ہی دیر تک رہتی ہے اور نہ اداسی۔ بلکہ ایسی محبوب ہستیوں کی یاد ہمیشہ کے لیے دل میں محفوظ رہتی ہے اور ایسے مسرور لمحوں کی یاد بھی جو کبھی مسکراہٹوں میں بسر ہوتے تھے۔ یہی یاد زندگی کی ویرانیوں میں رفیق بنتی ہے، سب کچھ اُجڑ جانے پر بھی زندگی کی تاریکیاں انہی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں ——— یہ جھلمل جھلمل کرتی ہوئی پیاری پیاری کرنیں ———!

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

پرانے لکھنے والوں میں جن ادیبوں نے نہایت جرأت اور استقلال سے نوجوانوں کا ساتھ دیا۔ ان میں علی عباس حسینی ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس کا انداز بیان پرانا ہے، لیکن موضوع پرانا نہیں، وہ فن کے مقرر اصولوں کو توڑے بغیر نئے ادب کا کامیاب نمائندہ ہے، زبان پر اُسے حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، اور فن کی باریکیوں سے وہ پوری طرح آگاہ ہے،

میلہ گھومنی کا کردار کچھ ایسا خاموش، پراسرار اور حیرتناک ہے، کہ افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی ہم اس نوجوان بنجارن کو کمبھ کے میلے سے بھی کہیں آگے منزلوں پر منزلیں طے کرتے دیکھتے رہتے ہیں، اس افسانے کا انداز بالکل پرانی داستانوں کا سا ہے، مگر کتنا رواں اور تیز۔ سطر سطر میں زبان کے چٹخارے، منو، چنو۔ میر صاحب۔ جو ان سب میلا گھومنی کے سے جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کو اس مختصر سے افسانے میں ایسی جامع صورت میں پیش کیا گیا ہے، کہ کٹر ترقی پسندوں کو بھی حسینی کے کمال فن کا معترف ہونا پڑتا ہے، جو لوگ محض مکالموں ہی سے کردار کی تکمیل کے قائل ہیں، ان کے لئے میلا گھومنی کا ساری کہانی میں صرف "ارے کیا ہو گیا لوگو" کہنے کے باوجود اردو افسانے کا ایک غیر فانی کردار ہونا دعوتِ فکر ہے۔

کانوں کی سنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں۔ اپنے ہی دیس کی داستان ہے، گاؤں گھر کی بات ہے، جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پہ جی چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے۔ اور آپ کو سننا! ——

دو بھائی تھے چنو منو نام، کہلاتے تھے پٹھان، مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا، اور ددھیال سیدواڑے میں۔ ماں پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کاج کرنے آتی تھی، ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو اور منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر بقولے جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انھوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لیے کچھ کھیت دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے۔ اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا۔ اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انھوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے

بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر متو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی، ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں انھوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ نکالے لجاتی ہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی، تو میر صاحب نے متو کی شکایت کی اور کہا "اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے" اس نے آہستہ سے کہا "تو میں کیا کر سکتی ہوں، آپ ہی جتّو کی طرح اسے بھی کسی "تاند سے لگا دیجیے"۔

میر صاحب بڑے سوچ میں پڑ گئے، یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنانخانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی۔ اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے صورت شکل دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اسی کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کے حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی

اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا "اچھا گھر میں رہو اور کام کرو، دو چار دن میں تمھارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے اس کی تاریخ یوں بیان کی۔ "راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن کبڑن سے درزن اور اب سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔" ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے بعد؟" وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی!"

میر صاحب جب گھر میں آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جزبز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں! وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اُسے معصیت کی طرف دھکیلتے ہیں پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا ہے اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی سی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر

انھوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہوگا"۔ بے چاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی۔ اس لیے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی، لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہیں کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی انہیں کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا، اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا، دلھن کو شہانا جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتنے لگے، بیتتے گئے، مہینے ہوئے، ایک سال ہوتے کو آیا۔ مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے ــــ کہ دفعتہً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی ہم پہنچیں معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے۔ اور جس طرح وہ

نشہ بیوی پر اتارتا ہے، اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک ہے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی، جولاہن سوائے "ماتما" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انھوں نے حکم دے دیا "آج سے یہیں رہو، گھر جانے کی ضرورت نہیں"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑہ ادھڑ جائے گا!" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا!" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی۔ اور تاڑی بند ہو گئی نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی، اور تاڑی بند ہونے کے چھ مہینے بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور منو ہونے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیے تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھلتی ہے۔ دو چار ہی دن اگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔

ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے کلّہ بہ کلّہ جواب دینا شروع کردیا۔ ایک دن نوبت ہاتھاپائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا بہو ساس کے سینے پر سوار ہوگئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ وہ ہائے کرکے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں لیکن بلغم کے ساتھ اب تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر گور میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا اور بین ہونے لگے۔ ساس بہو میں اسی پہ مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ دن تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا۔ اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی۔ کہ دفعتاً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آبیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دردِ دل بیان ہوئے تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخ روئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنادے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا۔ اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرمادیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہیں، پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کے بیٹے سے بولیں "چل رے گھر چل! مانگ میں سیندور میرے سامنے بھر دنیا وہ اب تیری بیوی ہے۔ میں خوش، میرا خدا خوش!"
—— چنو نے ماں کا کہنا کیا مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور اپنے چاروں بچے سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو مہینے بیتے، تین مہینے بیتے، مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اچک آگئی۔ اکڑنا، بررنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہم ٹن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے۔ ان کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دنوں اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم جی ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا، مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی چنیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، گھی، مکھن، ملائی، اور یہ چیزیں چار روپے کی نوکری میں کہاں نصیب؟ لگا کھسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور ٹیپیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا وہ بھاڈوں نہ سماتا۔ اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی۔ وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے والے ہی تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ دُلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا۔ اور وہ تڑاقا ہوا کہ جان پڑا اسی کے سر پہ بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ سنبھل کے اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے اماں! ارے اماں!" چیختا دوڑا۔ راستہ بھائی نہ دیتا تھا، دم گھٹا جا رہا تھا، مگر پاؤں پہیئے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا۔ سنبھلتا، پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بجری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا۔ اور اسی کی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو"! کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا "اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ——

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلا گھومنے الہ آباد چلی گئی!

احمد ندیم قاسمی

السّلام علیکم

تاخیر کے اسرار مجھے تو نہیں معلوم
کیوں کانپ رہے ہیں ترے ہونٹوں کے کنارے

گاؤں میں چھٹی لکھ دیتا۔ تو اسٹیشن پر کوئی ٹٹو، خچر یا گدھا ضرور موجود ہوتا۔ لیکن اول تو اُسے خط لکھنے کا وقت ہی نہ ملا تھا، دوسرے وہ اپنے بیوی اور بچے کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اترا۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں سے ڈھکی ہوئی گول گول ڈھیریاں اس نے چاروں طرف بکھری ہوئی دیکھیں تو اس کے کلیجے پر جیسے کسی نے برف سے زیادہ ٹھنڈی انگلی رکھ دی!

تین سال اس نے فرانس، میسوپوٹیمیا اور مصر میں گذارے تھے۔ تین سال وہ مورچوں کے دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا۔ کیچڑ سے بھری ہوئی خندقوں میں منہ کے بل لیٹا رہا۔ خاردار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا دبکا رہا۔ جب گولیاں شوکتی ہوئی اس کے سر پر موت کی ایک مہین لکیر کھینچتی گذر جاتیں۔ اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں کے دہانوں کے عین پہلو میں آکر پھٹتے اور وہ دھوئیں اور دھول سے اٹی ہوئی فضا میں اپنی بے رونق آنکھیں جھپکاتا ہوا رہ جاتا۔ جب ہوائی جہازوں کی پر اسرار بھنبھناہٹ سن کر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور بم کے گولے ایک تیز "وہ دووہ!" کے ساتھ بڑے اولوں کی مانند گرتے۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی اور دھندلی فضا میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور باہیں، کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آتے تو

اس کے دل کی نظریں اپنے وطن کی پست قد پہاڑوں پر جم جاتیں اور پھر اُن کے درمیان زرخیز وادیوں کے کناروں پر پہاڑوں کے دامنوں میں ننھے ننھے گاؤں ــــــ اور ان گاؤں کے بھولے بھالے باشندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں ــــــ کبڈی کے میلے اور بلوے کی تیاریاں ــــــ اس کی خوبصورت بیوی اور اس کا بھلا بچہ ــــــ یہ سب چیزیں رائی کے مرچیں لگا دینے والے پلستر کی طرح اس کے حافظے پر چمٹ جاتیں۔ اور بندوق میں کارتوس ڈالتے ــــــ دستی بم پھینکتے' یا لوہے کے خاردار تاروں پر لکڑی کے تختے' یا گلی سڑی لاشیں رکھ کر پھلانگتے ہوئے یہ احساس ہر وقت اس کی ڈھارس بندھائے رکھتا۔ کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں ــــــ بے یار و مددگار نہیں۔ اس کا اپنا وطن ہے۔ اپنا گاؤں ہے۔ اپنا گھر ہے۔ اس کی اپنی بیوی اور اپنا بچہ ہے۔ ان کی زندگی کی دعائیں مانگنے والی اور اس کی موت پر مدتوں تک سوگ منانے والی دو ہستیاں ایک پُر امن اور پرسکون جھونپڑی میں موجود ہیں۔

محاذ سے لوٹتے وقت جب وہ کسی زخمی کو لاشوں کے انبار کے نیچے کراہتا دیکھتا یا آٹھ دس دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضا پر اس کی نظریں پڑتیں۔ تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا! اور وہ محسوس کرتا جیسے اُس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھ دیا ہے اور لاش سے کچا بدبو والا غلیظ لعاب رسنے لگا ہے! یہ محسوس کرتے ہی وہ کانپ جاتا۔ جیسے بے شمار بموں کے دھماکے سُن کر اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں اور اس کی چکراتی ہوئی کھوپڑی خاک اور خون کے غیر محسوس ذرے بن کر کہیں کھو گئی ہے!

ائیدو بیم کے ان اجھیڑوں سے نکل کر وہ گھر آ رہا تھا لیکن ایک احساس رہ رہ کر اسے ستاتا تھا۔ اس کی روح کے ایک کچے زخم پر سے بار بار پھاہا اتر جاتا تھا۔ قدم قدم پر وہ واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے تیر جاتا۔ جب اُسے فرانس کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی لیوسی ملی تھی۔ لیوسی نے اُسے دو چار دن ذرا غور سے دیکھا تھا۔ اور ایک روز گلی کے موڑ پر ٹوٹی پھوٹی فرانیسی میں اس نے لیوسی کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ اسی رات وہ بارک سے کھسک کر لیوسی کے گھر کے قریب پہنچا۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکالے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کے پاس آیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر ماتھے کی آخری لکیر تک سنگِ مرمر میں ڈھلی ہوئی حسن و نزاکت کی پتلی لیوسی —— بڑی بڑی نیلی آنکھیں مٹکاتی —— لمبی لمبی خمیدہ پلکیں جھپکاتی —— سنہرے ملائم بال نیلی مہین رگوں کے جال میں پھنسے ہوئے سُرخ و سپید گالوں پر بکھیرتی اور مرمریں گردن میں ایک مبہم سا خم ڈالتی اس کی طرف بڑھی اور اپنی گوری گوری بھری باہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیں۔ اپنے لب اس کے لبوں پر کچھ ایسے انداز سے رکھے کہ اس کا دل پسلیوں سے ابھر کر اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اور صبح اسے لیوسی نے جگا کر کہا۔ "جاؤ، جاؤ، دن چڑھ آیا ہے۔ بگل کب کا بج چکا ہے، جاؤ!"

اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ لیوسی کے پاس بلا ناغہ آتا رہا۔ اور جب سال کے بعد ہندوستانی فوجیں پھر اسی گاؤں میں واپس آئیں تو وہ

لیوسی کی تلاش میں سارے گاؤں اور گاؤں سے باہر چراگاہوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اور آخر اسے ایک بڑھیا کی زبانی یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔ کہ "مس" لیوسی اپنا تین ماہ کا بچہ لے کر پیرس چلی گئی ہے۔ اور وہاں اتحادی فوجوں کے لیے صابن بنانے والے کارخانے میں کام کرتی ہے!

لیوسی کا خیال آتے ہی اس کا دل ایک لمحے کے لیے سکڑ جاتا، لیکن یہ خیال کر کے اسے تسلی ہو جاتی۔ کہ اس راز کو لیوسی اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا!

اور اب وہ تین سال زندگی اور موت کے کڑے امتحانوں سے گذر کر دو مہینے کی چھٹی پر گھر واپس آ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اُسے گذشتہ تین برس کی تنخواہ مل گئی تھی۔ اور چھ سو روپے یکمشت حاصل کر کے اسے یوں محسوس ہوا جیسے انگریزوں نے اپنے سارے خزانوں کی تھیلیاں اس کی جھولی میں الٹ دی ہیں!

اسٹیشن پر اتر کر اس نے سنتروں اور کیلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا خریدا۔ ریوڑیوں اور جلیبیوں کی ایک گٹھڑی باندھ لی۔ ایک نیا صندوق خریدا جس پر سبز پھولوں اور سرخ طوطوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بیوی کے لیے ایک ایسا دوپٹہ خریدا جسے آٹھ بار بھی کسی چیز پر تہ کر کے رکھا جاتا۔ تو یوں محسوس ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے۔ اپنے بچے کے لیے ایک قلم خریدا جس کے دوسرے سرے پر ایک پنسل اور پنسل کی دُم میں ربڑ کا ننھا سا ٹکڑا جڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی نے ننھے کو سکول بھیجنا شروع کر دیا ہو گا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتی تھی "میرا ننھا بد شکل ہے تو کیا ہوا —— یہ تو مدرسے کا منشی بنے گا

اور منشی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟!

بیوی کے لیے سلمے ستارے والی جوتی اور منے کے لیے سفید پھندنے والی سرخ ٹوپی خریدلی ——— اس نے سوچا۔ کہ تین سال بعد اس کی بیوی اور منا خدا جانے کن کن نعمتوں کے امیدوار بیٹھے ہونگے!

بستر وہیں اسٹیشن پر اپنے ہی گاؤں کے ایک قلی کے پاس رکھ کر اس نے پھلوں کے ٹوکرے صندوق اور مٹھائی کی گٹھڑی کو کچھ اس سلیقے سے باندھا۔ کہ سر پر اٹھاتے ہوئے اُسے کوئی وقت پیش نہ آئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور تارے آہستہ آہستہ آسمان کی گہری نیلی تہوں کے نیچے سے ابھر رہے تھے۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اس لیے روشنی کی کوئی امید نہ تھی۔ اُسے اپنے علاقے کی ننھی ننھی پگڈنڈیوں کے جال اپنے ذہن پر چاند کی کرنوں کی طرح ابھرتے محسوس ہوئے اور وہ بے فکر چلتا گیا۔ لیکن شاید وہقانوں نے پگڈنڈیوں کے رُخ بدل ڈالے تھے۔ کئی بار وہ کیاریوں میں گھس گیا۔ جو کنوئیں کے پانی سے لبریز تھیں۔ کئی مرتبہ گیہوں کے کھیت اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ کئی بار گول گول پتھروں کی حد بندیوں سے اس نے ٹھوکریں کھائیں لیکن اسے اپنے بھٹک جانے میں بھی ایک کیف سا محسوس ہوا۔ گیہوں کے بھیگے ہوئے پودوں کو چھو کر اسے اپنے جوانی کے دن یاد آگئے۔ جب درانتی سے گھاس کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھوں پر سبز رنگ چڑھ جاتا تھا۔ اور جب گھاس کے گٹھے اٹھانے میں وہ گاؤں بھر میں اول درجے کا قوی نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ گول گول پتھر جب اس کے ٹخنوں سے ٹکرا کر بجتے تو

اُسے اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آجائیں۔ جب گائے بکریوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس کی پنڈلیاں دُکھنے لگتی تھیں۔ اور کنکر اڑ اڑ کر اس کی ایڑیوں اور ٹخنوں کو زخمی کر دیتے تھے۔ اور جب تھک کر کسی پہاڑ کی کھوہ میں سوکھی لکڑیاں جلا کر وہ ایسے ایسے دوہے گاتا۔ جن کا مطلب خود اُسے معلوم نہ ہوتا تھا!

——— ان تصورات کے جلو میں لیوسی کا نازک پیکر تند آندھی کی طرح آتا اور اسے لمحہ بھر کے لیے جھنجھوڑ کر چلا جاتا!

جب وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہنچا۔ تو اُسے صرف ایک جگہ اندھی سی روشنی دکھائی دی۔ اور وہ جی ہی جی میں کڑھنے لگا۔ کہ اُس کی بیوی کو کس کم بخت نے اطلاع دے دی۔ کہ وہ جنگ پر سے واپس آرہا ہے! اس نے بہت بڑی گٹھڑی کو ایک تھکے ماندے شانے سے دوسرے تازہ دم شانے پر منتقل کرتے ہوئے اپنے دل سے کہا: "سارا مزا کرکرا ہو گیا! ساری لذّت ملیامیٹ ہو گئی!" ——— اس کی آدھی خوشیوں پر بچوں کے اُن نیلے پیلے غباروں کی سی جھریاں پڑ گئیں جن میں سے تھوڑی سی ہوا نکل گئی ہو!

جب اس نے اپنے گاؤں کی پہلی گلی میں قدم دھرا۔ تو ایک گول سا پتھر ڈھلان سے لڑھکتا ٹخ ٹخ بجتا کھائی میں گر گیا۔ اور پتھر کا شور سن کر قریب ہی ایک کتا تڑپ کر اٹھا اور زور سے بھونکا کہ سوئے ہوئے پہاڑ جاگ اُٹھے اور گاؤں کے مشرق سے مغرب تک کے ننھے پلّوں سے لے کر بڈھے بوڑھوں تک سب کتے بلبلا اُٹھے، تو اُس نے سمجھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے! اور جیسے مکانوں کی منڈیریں اس کی طرف سر ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں: "ہوں

چھپ چھپ کر آتے ہو؟ —— ہم سب کچھ جانتی ہیں —— تم امیر خاں سپاہی ہو —— تم سنہ چودہ کی لام سے واپس آرہے ہو۔ تمھاری بیوی نے تمھارے لیے سویاں پکا رکھی ہیں۔ تمھارا بچہ تمھارا حقہ تازہ کر رہا ہے۔ تمھارے خاندان کی عورتیں چھتوں پر بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمھیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم ہم سے چھپتے ہو؟ —— ہوں"۔

دیواروں کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا جب وہ مسجد کے قریب سے گذرا۔ تو اُسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کہ مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے اور مولوی جی جو اس وقت نماز پڑھا رہے تھے، بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، دیئے کی پیلی روشنی ان کی سفید براق ڈاڑھی پر پڑ رہی تھی۔ اور جب انھوں نے اللہ اکبر کہا۔ تو اس نے محسوس کیا کہ ان کی بتیسی بھی جھڑ چکی ہے۔ اور ان کی سُریلی آواز پرانی سارنگی کی اُس بے ہنگم تان میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جو اس کے آخری ڈھیلے ڈھالے تار سے بے خبری میں نکل گئی ہو!

مسجد کا دیا دیکھ کر اس کی خوشیاں پھر نئی شان سے اُبھریں۔ اُن نیلے پیلے غباروں میں پھر کسی نے ہوا بھر دی۔ اُس کا گھر مسجد کے قریب ہی تو تھا ایک میل دور سے اگر اُسے مسجد پر گھر کا دھوکا ہوا۔ تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی اندھیرے میں نظریں بھٹک ہی جاتی ہیں۔ اور پھر تین سال کا پھیر ہے۔ تین دنوں کا تو نہیں۔ کہ قیاس حرف بحرف صحیح نکلے!

وہ اپنے گھر کے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا۔ کہ ایک شخص اُس کے قریب سے "السلام علیکم" کہتا گزر گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ سلام کا

جواب دینے میں چالیس دنوں کی نماز کا ثواب ہے۔ لیکن وہ صرف اس لیے
خاموش رہا۔ کہ اُسے اپنے راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔ جس جذبے کو اپنے
سینے میں چھپا کر وہ میسوپوٹیما سے روانہ ہوا تھا اسے ذرا سی آواز نکال کر وہ خاک
میں کیونکر ملا دیتا۔

اس نے اپنے مکان کا بند دروازہ بے حد احتیاط سے کھولا۔ خشک
لکڑی کا مَس بجلی کی طرح اس کے قلب کی طرف دوڑا۔ اور وہ سر سے پاؤں
تک لرز گیا! گٹھڑی سر سے اُتار کر وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے لپٹ گیا
—— اس کا پرانا دوست —— مدتوں کا خاموش ساتھی —— جس کی
آڑ لے کر اس نے شادی سے قبل گاؤں کی ہر لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔
اور جس کے پیچھے چھپ کر اُس نے اپنی بیوی پر چھاچھ کی کلی کر دی تھی گٹھڑی
ہاتھ میں لٹکا کر اُس نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھا۔ مکان کے صحن میں
دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ چار پائیوں کے قریب
گیا۔ ایک خالی تھی اور دوسری پر اس کا بچہ سو رہا تھا۔ ایک بار اُس نے
سارے صحن کا چکر کاٹا اور جب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اس کی بیوی کہیں پڑوس
میں ہے تو وہ بڑھ کر اپنے بچے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دھیرے سے
بولا۔ "میرے بچے۔ میرے منے!" وفورِ مسرت سے اس کا گلا گھٹ گیا۔ اور
آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آسمان پر ننھے ننھے تارے اس کی خوشیوں سے
متاثر ہو کر کروٹیں سی بدلنے لگے۔ اور پڑوس میں کوئی بوڑھی بکری اپنی پھٹی پھٹی
آواز میں یوں ممیائی۔ جیسے پکار رہی ہو۔ "امیر خاں —— ہو امیر خاں!"

مسکرا کر اُس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالی۔ دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے اُس کا لڑکا بے شمار صورتیں اختیار کر کے اُس کے تصوّر پر منڈلانے لگا ـــــ تین سال اور چھ سال کی عمر میں بچّے کی شکل و صورت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کے دماغ کی سلوٹوں میں رینگنے لگیں اور جب دیا سلائی کی رگڑ سے چھرررر کی آواز پیدا ہوئی۔ تو جیسے اُس کے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا ـــــ تھن متھنا چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ۔ لٹکے ہوئے گال۔ چوڑی ناک۔ تنگ ماتھا۔ ذرا سی گردن ـــــ "میرا بچہ!" ـــــ وہ پکار اٹھا۔ اور جب وہ بوسے چومنے کے لیے اتنی بے شمار پیاری چیزوں میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرنے لگا تو بچّے کے دائیں گال پر ناک سے لے کر کان تک اُسے ایک سانولی سی لکیر نظر آئی۔ دیا سلائی بجھ گئی اور اُسے وہ دن یاد آگیا۔ جب اس کی بیوی بیمار تھی اور وہ خود چھری لے کر شلغم چھیلنے لگا تھا۔ اس کی بیوی یہ برداشت نہ کر سکی کھاٹ سے اتر کر چھری اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہی تو پاس ہی منا بیٹھا تھا۔ اس کے گال پر جا لگی اور خون کی ایک تیز دھار اس کے گلے سے ہوتی ہوئی اس کے ابھرے ہوئے پیٹ، پھولی ہوئی رانوں اور گھٹی ہوئی پنڈلیوں سے گزرتی ایڑی پر پڑنے لگی تھی۔ اُس کی بیوی نے دس سیر سوجی کے حلوے کی منت مانی تھی۔ اور جب ننھا اچھا ہو گیا۔ تو اُس نے دس سیر سوجی کا حلوا پکانے کے لیے نمبردار کے گھر سے بڑا دیگچا منگوایا اور جب فقیر سائیں کی خانقاہ پر جانے کے لیے اس نے میراثن کو بلوایا اور دیگچہ اُس کے سر پر دھرا تو وہ مسخری دو ایک بار

لڑکھڑائی اور چلا اٹھی "ہائیں مجھ نگوڑی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سوجی کا حلوہ بھی کمر توڑ ڈالتا ہے"!

اب اس نے جھک کر اسی سانولی لکیر پر اپنے خشک ہونٹھ رکھ دیئے اور بچے نے نیند میں انگڑائی لیتے ہوئے اس کے منھ پر ایک ننھا سا طمانچہ لگا دیا ——! قہقہہ ضبط کرنے کے لیے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ اٹھ کر سرکنڈے کے چھپر تلے آگیا، جہاں گٹھڑی پڑی تھی۔ صندوق کا کنڈا کھول کر مہین دوپٹے —— سلمے ستارے والی جوتی، اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو چھوا —— پھلوں کا ٹوکرا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ مٹھائیوں کی گٹھڑی صندوق پر دھر دی۔ روپوں کی پوٹلی پر ایسے ہی ہاتھ پھیرا اور یوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ نئی دنیا سے اس پرانی دنیا میں ایسی ایسی چیزیں لے کر آیا ہے۔ جن کا آج تک گاؤں والوں میں سے کسی نے نام تک نہیں سنا!

صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا۔ کہ اس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اس کے کان دل کی دھک دھک سننے لگے۔ اور پھر یہ دھمک صحن میں گھومنے لگی —— اوپر فضا میں اُٹھ گئی۔ —— کائنات میں پھیل گئی —— اندھیرے سے چھن کر ستاروں میں سما گئی —— زمین و آسمان اس کے دل کی دھڑکن کی تال پر ناچنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ جیسے اس کا کوئی بہت بڑا راز فاش ہونے والا ہے!

اچانک بھنچا ہوا دروازہ چرخ سے کھلا اور اس کی بیوی صحن میں داخل ہوئی —— اس کے دل کی دھک اچانک رک گئی۔ جیسے گاڑی کا انجن جنگلوں

اور پہاڑوں میں دندناتا ہوا یکایک تھم گیا ہے ——! ایک قلابازی کھا کر کوئی چیز اس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں بیٹھ گیا اس کا دماغ تپنے لگا! اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے! —— رونگٹے اس کے جسم پر چیونٹوں کی طرح سرسرانے لگے اُس نے اپنی انگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی مگر اسے درد محسوس نہ ہوا۔ جیسے وہ کسی لکڑی کو چبا رہا ہے!

اُس کی بیوی نے دیوار کے اندر پڑا ہوا دیا روشن کیا۔ اور ایک لمحے کے لیے امیر خاں کو ایسا محسوس ہوا کہ بیتے ہوئے دن اور تمام گھڑیاں دیئے کی لَو میں ٹمٹمانے لگی ہیں —— یوسی کی آنکھوں کی چمک بھی اس لرزتی ہوئی لَو میں جھلک رہی تھی!

تین برس —— جن کے خدا جانے کتنے دن ہوتے ہیں، اپنے تمام موسموں سمیت، اُس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کھڑے ہو گئے —— تین برس! —— اسے معلوم نہ تھا کہ ایک ایک برس اتنی موٹی دیوار چن سکتا ہے!

امیر خاں نے ان تین برسوں میں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا —— ہائیں! یہ کیا! —— امیر خاں کا ہاتھ اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا! —— اس کی بیوی کے انگ پر ریشمی قمیص تھی اور دوپٹہ —— دوپٹہ! —— اس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا! —— اس کی بیوی کے مہین دوپٹے میں سے اس کی بالوں کی سیاہی باہر نکل رہی تھی۔ امیر خاں کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ بیری کے پتے گھوٹ گھوٹ کر بالوں میں لگایا کرتی تھی۔ اور اس سے کہا کرتی تھی۔ "میرے بال اتنے لمبے ہو جائیں گے۔ اتنے لمبے ہو جائیں گے کہ بس تم دیکھا کرو گے!" ——

اور اب امیر خاں ان بالوں کو دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ اس کے بال بہت لمبے تھے اور جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کو بھی آٹھ بار تہ کر کے کسی چیز پر رکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا، جیسے شیشہ پڑا ہے!

چرچراہٹ ہوئی اور امیر خاں کی آنکھیں جو ابھی تک تین برسوں کے اندر برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں اپنی بیوی کے پاؤں پر پڑیں —— اس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف اٹھ گیا —— سلمے ستارے کی جوتی اس کے پاؤں میں تھی اور —— دیئے کے اس طرف ایک کھونٹی کے ساتھ ایک سفید پھندنے والی سرخ ٹوپی ٹنگ رہی تھی —— وہ آنکھیں میچ کر جھک گیا اور ہاتھ فرش پر ٹیک دیئے —— کوئی چیز اس کی انگلیوں سے مس ہوئی! یہ سنترے یا کیلا کا ایک چھلکا تھا اس نے وہ سوکھا ہوا چھلکا اٹھا کر یوں پھینکا جیسے قصائی گوشت پر سے چھیچھڑا اتار کر اڑا دیتا ہے! چھلکا اندھیرے میں مٹی کے کسی برتن سے ٹکرایا —— آہٹ ہوئی! —— اس کی بیوی ایک دم چونکی! امیر خاں نے، جو کہ ابھی اس چھلکے کی گرفت انگلیوں میں محسوس کر رہا تھا، جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپوں کی پوٹلی کو چھوا —— اس کی بیوی آہٹ کی جستجو میں بڑھی —— ممٹی! —— اس کے شیشے ایسے دوپٹے کا ایک کونہ جس میں کچھ بندھا تھا۔ پھسل کر نیچے گرا —— ہلکی سی چھنن کی آواز آئی —— امیر خاں نے جیب میں اپنے روپوں کی پوٹلی پر سے اس وحشت سے انگلیاں اٹھائیں جیسے اسے بے شمار سانپوں نے بیک وقت ڈس لیا ہے!

اس کی بیوی نے جھٹ سے دوپٹے کا وہ کونہ اپنے سینے میں اڑس لیا اور کوٹھری

کی طرف بڑھی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب گئی اور تین برس پھر امیر خاں کی چوڑی چھاتی پر سوار ہو کر ناچنے لگے!

اس کی نگاہیں اپنے بچے، اس کے چہرے کی سانولی لکیر ---- کیلے اور سنتروں کے بکھرے ہوئے چھلکوں اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو دیکھ رہی تھیں مگر ان چیزوں کا نقش اس کے دماغ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہ برف کے ڈھیلے پر لکیریں کھینچ رہا ہے!

جمائی کی اونچی آواز آئی۔" امیر خاں نے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے معلوم ہوا۔ جیسے دروازہ ابھی تک منھ کھولے جمائی لے رہا ہے اس نے تین برسوں کے شور و غل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا ---- کچھ ---- ایک پتلی دبی دبی آواز جو کوٹھری میں سے آ رہی تھی ---- امیر خاں سارے کا سارا کان بن گیا ---- آواز آئی " جاؤ۔ جاؤ، دن چڑھ آیا ہے، مُرغ کب کے بانگیں دے چکے ---- جاؤ۔"

امیر خاں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہ امیر خاں کدھر ہے ---- اور امیر خاں کا گھر ہے یا یوسی کا مکان اور یہ اس کی بیوی کی آواز ہے یا یوسی کی ---- یہ کون ہے اور یہ کسے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ---- اور، وہ کیا سوچ رہا ہے ---- وہ ---- کچھ نہیں ---- کچھ نہیں!

اندر سے پھر ایک آواز تیرتی ہوئی آئی اور اس کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح گھس گئی " اٹھو۔ اٹھو۔ میں دیکھ آئی ہوں۔ نمبر دار کا دروازہ بند ہے ---- اب نکلو بھی یہاں سے ---- نگوڑا پتہ بھی کھڑکے تو میں اچھل پڑتی ہوں ----

جاؤ، جاؤ بھی۔ پر یاد رہے کل منے کے لیے ریوڑیاں اور جلیبیاں ضرور لیتے آنا۔"

امیر خاں نے روپوں کی پوٹلی نکال کر ریوڑیوں کی گھٹڑی پر دھر دی۔ لیکن ایک دم اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہاتھ کے دباؤ سے ریوڑیاں کڑکڑ بولنے لگی ہیں!

اس کا دماغ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا۔ دیوار سے چپٹا وہ باہر کھسکنے لگا۔ اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا کہ کوٹھڑی سے اندھیرے میں ایک بھیگا ہوا آدمی باہر نکلا ہے۔ امیر خاں کے تین برس کے واقعات سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے اس نے انگڑائی لی اور کہا "لے آؤں گا —— پہلے کبھی انکار کیا ہے۔ کہ اب اتنی تاکید کر رہی ہو!"

منے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور زیر لب کہنے لگا۔ "امیر خاں سے اس کی شکل کتنی ملتی ہے"

امیر خاں کی بیوی نے بڑھ کر اپنے بچے کی سانولی لکیر پر اپنے لب رکھ دیئے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "امیر خاں سے تیری شکل سچ مچ کتنی ملتی ہے!" —— اور امیر خاں نے دیئے کی دھندلی روشنی میں اپنی بیوی کے دائیں گال پر پانی کی ایک پتلی سی سانولی لکیر دیکھی وہ وحشیوں کی طرح لپک کر باہر گلی میں آ گیا! گلی کے نکڑ پر اچانک اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ فرانس کے گاؤں کا وہ نکڑ اسے یاد آ گیا جہاں اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں لیوسی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تھا!

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ کہ ایک شخص اس کے قریب سے گزرا۔ امیر خاں نے کہا "السلام علیکم" جانے والا تیورا کر پیچھے ہٹا اور سلام کا جواب دیئے بغیر نمبردار کے مکان کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتا ایک گلی میں غائب ہو گیا۔